تدبّر

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبّرِ قرآن و حدیث

لاہور۔ پاکستان

سلسلہ ۲۱ رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ مئی ۱۹۸۷ء

تدبّر

فہرستِ مضامین

تذکرہ و تبصرہ

محمد بن شہاب زہری ———— خالد مسعود ۳

تدبرِ قرآن

تفسیر سورۃ مائدہ (۱) ———— خالد مسعود ۱۰

حکمتِ قرآن

جبر و اختیار کا مسئلہ

فلسفہ اور قرآن کی روشنی میں (۳) ———— امین احسن اصلاحی / محبوب سبحانی ۱۶

تاریخ و سیر

اسلامی معاشرہ کا ایک بڑا آدمی (۲) ———— امین احسن اصلاحی ۳۴

ہامان کی اثری تحقیق ———— سید شیر محمد ۴۳

مجلسِ ترتیب:

- خالد مسعود (مدیر)
- عبد اللہ غلام احمد
- ماجد خاور
- محبوب سبحانی

ناشر: ادارہ تدبر قرآن و حدیث
رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، چمن آباد، لاہور - ۲۵

مطبع: المطبعۃ العربیۃ۔ لاہور

قیمت: ۵/= روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

خالد مسعود

محمد بن شہاب زہری

تدبر کے پچھلے دو شماروں میں ہم نے روایتِ افک کے بارے میں حکیم نیاز احمد صاحب اور شیخ الحدیث شبیر احمد میرٹھی صاحب کی تحقیقات کا تعارف کرایا تھا اور یہ بتایا تھا کہ حکیم صاحب کے نزدیک اس روایت کو موجودہ شکل میں ترتیب دینے اور اس کو پھیلانے کے اصل ذمہ دار محمد بن شہاب زہری ہیں جو مرسل احادیث روایت کرنے میں بے باک اور سنی سنائی باتوں سے افسانہ تیار کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ حکیم صاحب کا یہ نقطہ نظر احادیث کے ہر طالب علم کو پریشان کر دیتا ہے کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ امام مالکؒ کی موطا ہو یا صحیح بخاری، زہری کا عمل دخل ان کتابوں میں اتنا زیادہ ہے کہ وہ مجموعوں کے مرتبین کی ایک ناگزیر شخصیت نظر آتے ہیں۔ رجال کی کتابوں میں دیکھیے تو زہری کو امام، حجت، حافظ، ثقہ، عدل، تمام القاب سے نوازا گیا ہے اور ان کی جلالتِ شان، علوِ مرتبت، تبحر علمی، فہم و ذکا، زہد و ورع، ہر چیز کا قصیدہ لکھا گیا ہے۔ اس سے ایک قاری سوچنے لگتا ہے کہ وہ ایسی بلند پایہ شخصیت کے بارے میں وہ باتیں کیسے مان لے جو حکیم صاحب بیان فرماتے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ اہل تحقیق زہری کی خدمت حدیث کا ناقدانہ جائزہ لینے کے بعد کوئی رائے قائم کریں۔ اس سلسلہ میں چند اشارات ہم ان صفحات میں کرنا چاہتے ہیں۔

جہاں تک اس حقیقت کا تعلق ہے کہ زہری مرسل احادیث بکثرت بیان کرتے ہیں، تذکرہ نگار اس پر متفق ہیں۔ ابن حجرؒ نے تہذیب التہذیب میں ابوداؤد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ زہری کی کل روایات کی تعداد دو ہزار دو سو ہے جن میں سے صرف نصف مکمل سند کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ اور دو سو روایتیں غیر ثقہ لوگوں سے ہیں۔ حافظ ذہبیؒ کے نزدیک زہری کی وہ تمام روایات جو حضرت رافعؓ بن خدیج اور حضرت عبادہؓ بن الصامت سے منسوب ہیں، مرسل ہیں۔ امام مالکؒ نے موطا میں زہری کی مراسیل کو قبول کیا ہے لیکن امام شافعیؒ ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ وہ فرماتے ہیں:

ارسال الزهری لیس بشئ لانا نجده یروی عن سلیمان بن ارقم
(سیر اعلام النبلاء للذهبی، اخبار الزهری)

زہری کی مراسیل کی کوئی وقعت نہیں۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ وہ سلیمان بن ارقم جیسے آدمی سے بھی روایت لے لیتے ہیں۔

ان سلیمان بن ارقم کو محدثین نے ساقط اور متروک قرار دیا ہے۔ ابن حجر کی رائے میں یہ شخص روایات میں الٹ پھیر کردیتا اور موضوع روایتیں ثقہ لوگوں سے منسوب کرکے بیان کیا کرتا تھا۔ یحیٰی بن سعید القطان کہتے ہیں کہ دوسروں کی نسبت زہری کا مرسل روایتیں بیان کرنا بدتر ہے کیونکہ ان کا شمار حفاظ حدیث میں ہے وہ ایسی روایتوں کے بارے میں کہتے "ھو بمنزلة الریح" (یہ گوز کی حیثیت رکھتی ہیں)۔ (تہذیب التہذیب لابن حجر)۔

ائمہ فن نے زہری پر جو تبصرے کیے ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان کی علمی دیانت پر بھی شبہ کیا ہے۔ یحیٰی بن سعید القطانؒ کہتے ہیں کہ زہری راویوں میں سے جن کا نام لینا مناسب خیال کرتے ان کو بیان کردیتے اور جو راوی پسند نہ ہوتے ان کا نام حذف کرجاتے۔ امام ذہبیؒ اپنی رائے یوں بیان کرتے ہیں۔ زہری کی مرسل روایات معضل کی طرح ہوتی ہیں۔ کیونکہ اس میں انہوں نے دو دو راوی بھی چھوڑے ہوتے ہیں۔ یہ گمان کرنا صحیح نہیں ہوتا کہ انہوں نے صرف صحابی کا نام ساقط کردیا ہوگا کیونکہ روایت اگر صحابی تک پہنچی ہو تب تو وہ صحابی کا نام ضرور واضح کرتے ہیں اور اسے موصول روایت ظاہر کرنے سے عاجز نہیں رہتے۔ اگرچہ وہ کسی خاص صحابی کا نام لینے کے بجائے صرف یہی کہہ سکتے ہوں کہ "عن بعض اصحاب النبی" (کسی صحابی رسول سے روایت ہے) موطا کے مشہور شارح زرقانی لکھتے ہیں کہ زہری کا حال یہ ہے کہ جب وہ چند راویوں سے دلیل لے رہے ہوں تو روایت کے بیان کے وقت اپنی طبیعت کی ترنگ کے مطابق ایک بار سب سے اکٹھی روایت بیان کردیں گے اور دوسری بار کسی ایک سے کبھی وہ ایک کی روایت دوسرے کی روایت میں دخل کردیتے ہیں جیسا انہوں نے روایت افک اور بعض دوسری روایتوں میں کیا ہے کبھی یہ ہوتا ہے کہ طبیعت ذرا کسل مند ہوئی تو مرسل روایت بیان کردی اور اگر نشاط ہوا تو اس کو موصول کردیا یہی وجہ ہے کہ ان کے بارے میں بڑا اختلاف واقع ہوا ہے۔ (شرح الزرقانی علی موطا الامام مالک جلد دوم صفحہ ۲۲۸)

معلوم ہوتا ہے زہری نہ صرف سند حدیث میں اس طرح کے طرز عمل کو درست سمجھتے تھے بلکہ الفاظ روایت میں بھی تصرف کو جائز سمجھتے تھے۔ چنانچہ امام ذہبیؒ نے یونس بن محمد کی روایت سے ابو اویس کی یہ شہادت نقل کی ہے کہ میں نے زہری سے الفاظ حدیث میں تقدیم وتاخیر کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا "یہ تو قرآن میں بھی جائز ہے، تمہیں حدیث میں اس کے جائز ہونے پر شبہ ہے؟ جب حدیث کا مفہوم درست

رہے، تقدیم وتاخیر کرنے سے کوئی حرام حلال ہوتا ہو نہ کوئی حلال حرام، تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جن کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ وہ زہری کو سنن ماضیہ کا سب سے بڑا عالم سمجھتے تھے، یہ رائے بھی رکھتے تھے کہ:

ما اتاک به الزهری عن غیره فشد یدک به وما اتاک به عن رایه فانبذه
(سیر اعلام النبلاء)

زہری دوسروں کی کوئی چیز پیش کریں تو اس کو تھام لو اور جو کچھ اپنی رائے سے کہیں اس کو دے مارو۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زہری کی جلالت شان اور تبحر علمی کے باوجود ان کے اپنے زمانے میں بھی ایک رائے ان کے خلاف رہی ہے۔ بعض بڑے لوگ ان کی آراء کو بے وقعت اور ان کی علمی دیانت کو مشتبہ قرار دیتے رہے ہیں۔ امام مالکؒ زہری سے استفادہ کرتے رہے تھے۔ ان کا ان پر حسن ظن قائم ہوگیا۔ لہٰذا وہ موطا میں ان کا دفاع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بہت ساری روایات میں وہ اپنے شیخ کا نام واضح نہیں کرتے صرف یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ روایت ایک ایسے شخص سے ہے جو میرے نزدیک قابل اعتماد ہے۔ (عن اثق به) ایسی روایات کی بعد میں صحیحین میں تخریج ہوئی تو معلوم ہوا کہ امام مالکؒ کے وہ قابل اعتماد شیخ زہری تھے۔ امام مالکؒ کا یہ کہنا کہ وہ میرے نزدیک قابل اعتماد ہیں۔ یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لیے کافی ہے کہ ان کے زمانے میں بھی جرح کرنے والے زہری کے بارے میں اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔

باقی رہا زہری کے مذہب کا معاملہ تو اس بارے میں حکیم صاحب کی یہ رائے نہایت معتدل معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے میں شیعہ اپنے الگ مسلک کے ساتھ زیادہ نمایاں نہیں ہوتے تھے۔ علویوں کے خیالات کے ساتھ ہم آہنگی اور ان کے مقاصد کے حصول میں ان کی معاونت سے ان کے رجحان کا اندازہ ہوتا تھا۔ زہری کے معاملے میں یہ ہوا کہ مالی مشکلات نے ان کو بنی امیہ کے دروازے سے وابستہ ہونے پر مجبور کردیا جس کی وجہ سے ان کا مذہب مشتبہ ہوگیا، تاہم ان کے خیالات اس زمانے کے شیعہ ہی کی طرح تھے۔ اس رائے کی تصدیق زہری کے تذکرہ نگاروں کے بیانات سے ہوجاتی ہے۔ ابن الاثیر زہری کی خدمت حدیث کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ تابعین کی ایک بڑی جماعت سے انہوں نے ایسی منفرد روایتیں بیان کی ہیں جن میں سے بخاریؒ مسلم میں کوئی روایت نہیں آئی حالانکہ یہ سب صحیح ہیں۔ عدول سے عدول کی روایت ہیں اور فقہا کے درمیان متداول ہیں۔ ظاہر ہے کہ مراد وہ روایتیں ہیں جو شیعہ فقہا کے ہاں متداول ہیں، ہمارے ہاں وہ معمول بہا نہیں۔ شیعوں کے ثقہ وجلیل امام علی بن محمد الخزاز نے زہری کی وہ روایتیں جمع کی ہیں جن سے ان کا شیعہ ہونا ثابت

ہوتا ہے۔ مثلاً یہ روایت کہ امام بارہ ہوں گے اور مہدی محمد بن علیؒ کی ساتویں نسل میں ہوں گے۔ الخزاز کے خیال میں تقیہ کے باعث زہری کی ظاہری مخالفت کچھ زیادہ ہوگئی جس سے شیعوں میں ان کے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں۔ شیخ عماد الدین طوسی نے زہری کو امام جعفر صادق کے ساتھیوں میں بتایا ہے شیعہ مصنفین نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ امام علی بن الحسین کو امام زین العابدین کا لقب دینے والے زہری تھے۔

آیۃ اللہ عبداللہ المامقانی نے اپنی کتاب تنقیح المقال فی احوال الرجال میں شیعہ رجال کے حالات جمع کیے ہیں۔ انہوں نے زہری کے بارے میں اپنے مذہب کے لوگوں کی رائے کا اختلاف نقل کرنے کے بعد اپنی رائے دیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ زہری متلون مزاج تھے جن کی رائے سیدھی نہیں تھی۔ اس لیے ان کی ہر روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ مامقانی نے ان کو ضعیف شیعہ میں شمار کیا ہے۔

چند سال قبل شیعہ رجال کے بارے میں ایک اور تحقیق میرزا محمد باقر موسوی اصفہانی نے کی ہے اور اسے روضات الجنات فی احوال العلماء والسادات کے نام سے شائع کیا ہے اس میں وہ زہری کی حیثیت کے بارے میں رایوں کے اختلاف پر بحث کرنے کے بعد اپنی رائے یوں پیش کرتے ہیں:

"ان تمام اقوال و احوال پر غور کرنے کے بعد میرے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ ابتدا میں زہری علمائے اہل سنت اور شیطان کی پارٹی کے ساتھ تھے۔ جیسا کہ تاریخ ابن خلکان میں بیان ہوا ہے۔ بعد میں ان کے علم و ادراک نے حق مبین کی طرف ان کی رہنمائی کی اور آخر عمر میں ان کو امام زین العابدین کی طرف رجوع کرنے والوں میں بنا دیا۔ تب یہ ان لوگوں میں ہوگئے جو امام کے انفاس شریفہ سے مستفید ہونے والے، ان کے کلمات پر اعتماد کرنے والے، اپنے دست و بازو اور زبان سے ان سے محبت کرنے والے، ان کے رازوں کے امین اور ان کی عظمتِ شان اور پختگی دلیل کے اعلان کرنے والے تھے۔"

اس کتاب نے زہری کی خاص خاص روایات سے استشہاد کیا ہے کہ وہ حقیقی شیعہ تھے اور امام زین العابدینؑ کی تعریف میں تو انہوں نے یہ تک کہہ دیا تھا کہ 'اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ' (اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا تاج کس کو پہنائے) مندرجہ بالا تمام اقوال و آراء شیعہ خود اپنے ایک فرد کی حیثیت کے تعین کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ لوگ اپنے اندر کسی غیر شیعہ کو شامل کرنے کے معاملہ میں حد درجہ محتاط اور متعصب ہیں۔ ان کے علماء کی فہرست بس سینکڑوں میں ہے۔ لہٰذا زہری کا ضعیف شیعہ قرار پانا بھی ان کے مسلک کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔

۱۔ زہری کی حیثیت بطور راوی حدیث اور بطور ایک شیعہ کے بیان کے لیے ہم نے امام ذہبی کی تصانیف

عقیدت کی عینک اتار کر جانچا جائے تو ہماری اپنی کتب حدیث سے یہ شہادت ملتی ہے کہ صحاح میں جو روایتیں شیعہ عقیدہ یا شیعی نقطۂ نظر کے مطابق داخل ہوگئی ہیں ان کا بہت بڑا حصہ زہری کی سند سے مروی ہوا ہے بلکہ زہری روایت میں منفرد ہیں۔ ایسی روایات کا استقصا تو تحقیق کا ایک مستقل موضوع ہے۔ ہم صرف بعض اہم روایات کی نشاندہی کرتے ہیں:

۱۔ حدیث قرطاس، جس کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے قبل اپنی بیماری میں کاغذ مانگا اور اس پر اپنی وصیت درج کرنے کی خواہش کی لیکن وہاں موجود لوگوں نے یہ رائے دی کہ بیماری کا اس وقت غلبہ ہے۔ جبکہ ہمارے پاس قرآن موجود ہے اور کتاب اللہ ہمارے لیے کافی ہے۔ لوگوں کے اس جھگڑے کے باعث وصیت لکھنے سے رہ گئی۔ اس روایت کو بخاریؒ نے لیا ہے اور یہ شیعہ مذہب کی بنیاد ہے۔ شیعہ حضرت علیؓ کو وصی رسول اللہ قرار دینے میں اس روایت سے استشہاد کرتے ہیں اور حسبنا کتاب اللہ کہنے والوں پر سب و شتم کرتے ہیں۔

۲۔ یہ روایت کہ آنحضرتؐ کے آخری مرض میں حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ وہ آنحضرتؐ کے بعد خلافت کے لیے اپنی نامزدگی کروالیں ورنہ اللہ کی قسم تین دن کے بعد ڈنڈے سے ہانکے جائیں گے۔ یہ روایت بھی بخاریؒ نے لی ہے اور شیعہ نقطہ نظر کے مطابق ہے۔

۳۔ باغ فدک میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حضرت ابوبکرؓ سے اپنا حصہ مانگنے اور ان کے انکار کرنے کی روایت۔ فدک کا مسئلہ بھی شیعہ کے ہاں بنیادی مسئلہ ہے اور اس کی تفصیلی روایت بخاری میں ہے۔

۴۔ حضرت زید بن ثابت سے یہ روایت کہ مصحف کی تیاری کے وقت سورہ احزاب کی آیت من المومنین رجال صدقوا ...... الخ جو میں رسول اللہ سے سنا کرتا تھا، میں نے گم پائی۔ اس کی تلاش ہوئی تو وہ خزیمہ بن ثابت انصاری کے پاس ملی۔ دوسری روایت میں سورہ توبہ کی آخری آیتیں نہ ملنے کا ذکر ہے جو بالآخر ابو خزیمہ انصاری کے پاس پائی گئیں۔ اس طرح کی روایات اس نقطۂ نظر کی مخالفت کے لیے بیان ہوئیں کہ آنحضرتؐ کی وفات کے وقت تک قرآن مجید ان علینا جمعہ و قرآنہ کے وعدہ کے مطابق محفوظ ہوچکا تھا۔ شیعہ نے جمعِ قرآن کو صحابہ کرامؓ کا کام قرار دیا۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ آیات قرآن متفرق تھیں، اپنی مرضی سے ان کو جمع کیا گیا۔ اہل بیت کے حق میں وارد آیتیں مصحف میں

سیر اعلام النبلاء، تذکرۃ الحفاظ اور میزان الاعتدال، حافظ ابن حجر کی تہذیب التہذیب، آیۃ اللہ المامقانی کی تنقیح المقال فی احوال الرجال اور محمد باقر موسوی کی روضات الجنات فی احوال العلماء والسادات پر اعتماد کیا ہے۔

شامل نہ کی گئیں۔ ان روایات سے یہ نتیجہ بھی نکلا کہ جس طرح سورہ توبہ اور سورہ احزاب کی آیات مفقود پائی گئیں، معلوم نہیں اور کتنی آیات ایسی رہی ہوں گی جو مصحف میں درج ہونے سے رہ گئیں۔ شیعہ کے اٹھائے ہوئے اسی فتنہ کی بنیاد پر مستشرقین کا قرآن مجید پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ موجودہ مصحف ناتمام ہے۔ معلوم نہیں کتنی آیات اس کی تدوین کے وقت مصلحتاً شامل نہ کی گئیں یا وہ ہاتھ نہ آئیں اور درج ہونے سے رہ گئیں۔

شیعہ کا ایک محبوب مشغلہ خلفائے راشدین اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی تنقیص بھی ہے۔ زہری بعض ایسی روایات میں منفرد ہیں جن سے امت کے ان اساطین کی ہجو کا پہلو نکلتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں اس خواب کا ذکر جس کے مطابق کنویں سے پانی نکالنے میں حضرت ابوبکرؓ نے ضعف دکھایا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے حالات کا جس جرأت مندی سے مقابلہ کیا وہ تنہا انہی کا حصہ تھا۔ انہوں نے بغاوتوں کو دبانے اور لوگوں کو دین کے قوانین کا پابند کرنے میں کسی مصلحت کو آڑے نہیں آنے دیا۔

۲۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ہشام بن حکیم بن حزام کی تلاوت سنی تو ان کو غلط پڑھنے پر نماز ہی میں کھینچنا چاہا۔ پھر ان کو نبی صلعم کے پاس لے گئے۔ جب آپ نے ان کی تلاوت کو درست قرار دیا تو سیدنا عمرؓ کے دل میں بدگمانی پیدا ہوئی۔ پھر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ قرآن سبعہ احرف پر نازل ہوا ہے۔ اس روایت میں حضرت عمرؓ پر حلم کی کمی کے ساتھ ساتھ قرآن میں اختلاف قرأت کے جواز کی تعلیم بھی دے دی گئی تاکہ امت کے اندر اختلاف کا دروازہ کھلا رکھا جا سکے۔

۳۔ موطا میں باب رضاعت الکبیر کی یہ روایت کہ سیدہ عائشہؓ جن مردوں کو اپنے پاس آنے کا موقع دینا چاہتیں وہ ان سے کہتیں کہ وہ ان کی بہن ام کلثوم یا بھانجیوں، بھتیجیوں میں سے کسی کا دودھ پی لیں، اس طرح وہ مرد آپ کے محرم قرار پاتے اور ان کو آپ کے پاس آمد و رفت کی اجازت مل جاتی۔ اس حدیث میں نہ صرف حضرت عائشہ صدیقہؓ بلکہ خاندان صدیقؓ کی تمام خواتین کو بدنام کیا گیا ہے اور ان کو ایک ایسا الزام دیا گیا ہے جس کا تصور ہم شما اپنی خواتین کے بارے میں بھی نہیں کر سکتے۔

۴۔ خود روایت افک، جیسا کہ دو فاضل محققین نے ثابت کیا ہے حضرت عائشہؓ کی تنقیص کے لیے وضع کی گئی ہے اور درایت پر کسی طرح پوری نہیں اترتی۔

یہ اور اس طرح کی مزید کئی روایات خالص شیعی نقطہ نظر کی حامل ہیں اور سب کی سب زہری کے واسطہ سے آئی ہیں۔ ہمارے علماء کو ان کی دور از کار تاویلیں کرنی پڑتی ہیں۔ اہل تحقیق خود ان کو پرکھ سکتے ہیں۔ ہم نے یہاں اس مقصد سے ان کو نقل کیا ہے کہ زہری کی شخصیت کا یہ خطرناک پہلو بھی لوگوں کے سامنے رہے اور ہم ان کی شخصیت

سے عقیدت کے باعث اتنے فراخ دل نہ ہو جائیں کہ ان کی وہ روایات بھی رد و قدح کے بغیر تسلیم کر لیں جن کا وجود صرف زہری کے مذہبی مسلک کا مرہون منت ہو۔ ادارہ تدبر قرآن و حدیث اپنے طور پر زہری کی مرویات کا ایک جائزہ لینے کی کوشش کرے گا تاکہ یہ دیکھا جا سکے کہ ان کی ایسی منفرد روایات کون سی ہیں جن کو انہوں نے اپنے مسلک کی اشاعت کا ذریعہ بنایا ہے۔ ہم دوسرے اہل علم کو بھی اسی بات کی بھی دعوت دیتے ہیں۔

زہری کے اس تذکرہ سے ہم ان کی خدمت حدیث یا عالی مقامی کا انکار نہیں کرنا چاہتے بلکہ صرف عقیدت کے اس جذبۂ فراواں کے اندر چھپے ہوئے خطرات سے متنبہ کرنا چاہتے ہیں جو درایت حدیث کی راہ میں سنگ گراں بن جاتا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ ان روایات کے قبول میں ہمارے اندر احتیاط پیدا ہو جو ایک خاص مسلک کے نقطۂ نظر کے مطابق داخل دین کر دی گئی ہیں۔

سورۂ مائدہ (۱)

اے ایمان والو! اپنے عہد و پیمان[1] پورے کرو۔ تمہارے لیے انعام کی قسم کے تمام چوپائے[2] حلال ٹھہرائے گئے بجز ان کے جن کا حکم تم کو پڑھ کر سنایا جا رہا ہے، نہ جائز کرتے ہوئے شکار کو حالتِ احرام میں۔ اللہ حکم دیتا ہے جو چاہتا ہے ۱

اے ایمان والو، شعائرِ الٰہی کی بے حرمتی نہ کیجیو، نہ محترم مہینوں کی، نہ قربانیوں کی، نہ پٹے بندھے ہوئے نیاز کے جانوروں کی، نہ بیت اللہ کے عازمین کی جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طالب بن کر نکلے ہیں[3]۔ اور جب تم حالتِ احرام سے باہر آجاؤ تو شکار کرو اور کسی قوم کی دشمنی کہ اس نے تمہیں مسجد

مضمون: اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ سے اپنی آخری اور کامل شریعت پر پوری پابندی کے ساتھ قائم رہنے اور اس کو قائم کرنے کا عہد و پیمان لیا ہے اور وہ اصول و ضوابط واضح کیے ہیں جن کا اہتمام عہدِ الٰہی پر قائم و استوار رہنے کے لیے ضروری ہے۔

[1] عہد و پیمان میں قول و قرار، قسم اور کسی معاملے میں گواہی کی ذمہ داری سے لے کر خدا اور اس کے بندوں کے درمیان کے عہد و میثاق تک سب شامل ہے۔

[2] انعام کا لفظ بھیڑ بکری، اونٹ اور گائے بیل کے لیے معروف ہے۔ اس قبیل کے تمام چوپائے، خواہ گھریلو ہوں یا وحشی، جائز ٹھہرائے گئے۔

[3] اوپر حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت فرمائی تھی کہ یہ چیز احرام کے تقدس اور اس کے درویشانہ مزاج کے خلاف ہے۔ اب یہ اسی تعلق سے تمام شعائرِ الٰہی کے احترام کی تاکید فرمائی ہے۔ شعائر کسی اہم دینی و روحانی حقیقت کے مظہر اور پیکر ہیں اور خدا کے مقرر کردہ ہیں اس لیے ان کے احترام کے آداب و شرائط کی خلاف ورزی بہت بڑا گناہ ہے۔

حرام سے روکا ہے، تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم حدود سے تجاوز کرو۔ تم نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو، گناہ اور تعدی میں تعاون نہ کرو[4] اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ سخت پاداش والا ہے ۲

تم پر مردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور وہ جانور حرام کیا گیا جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، اور وہ جو گلا گھٹنے سے مرا ہو، جو چوٹ سے مرا ہو، جو اوپر سے گر کر مرا ہو، جو سینگ لگ کر مرا ہو، جس کو کسی درندے نے کھایا ہو بجز اس کے جس کو تم نے ذبح کر لیا ہو، اور وہ جو کسی تھان پر ذبح کیا گیا ہو[5]، اور یہ کہ تقسیم کرو تیروں کے ذریعے سے[6]۔ یہ سب باتیں فسق ہیں۔ اب یہ کافر تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے تو ان سے نہ ڈرو، مجھی سے ڈرو۔ اب میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند[7] فرمایا۔ پس جو بھوک میں مضطر ہو کر بغیر گناہ کی طرف مائل ہوئے، کوئی حرام چیز کھا لے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۳

وہ پوچھتے ہیں ان کے لیے کیا چیز حلال ٹھہرائی گئی ہے[8]۔ کہو تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال چیزیں ٹھہرائی گئی ہیں اور شکاری جانوروں میں سے جن کو تم نے سدھایا ہے اس علم میں سے کچھ سکھا کر جو خدا

---

[4] یعنی اہلِ ایمان دوسروں کے غلط رویہ کے ردِعمل میں انہی کی سی روش اختیار نہ کریں کیونکہ یہ بدی میں تعاون ہوگا۔ وہ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کریں خواہ یہ کام دشمن کے ہاتھوں انجام پا رہے ہوں۔

[5] عرب میں ایسے تھان اور استھان بے شمار تھے جہاں دیویوں، دیوتاؤں، بھوتوں اور جنوں کی خوشنودی کے لیے قربانیاں کی جاتی تھیں۔ ایسی قربانیوں کے اندر حرمت بارادۂ تقرب و خوشنودی استھانوں پر ذبح کیے جانے ہی سے پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اسی حکم میں وہ قربانیاں بھی ہیں جو مزاروں اور قبروں پر پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں بھی صاحبِ مزار اور صاحبِ قبر کی خوشنودی مدنظر ہوتی ہے۔

[6] عرب جوئے کے تیروں کے ذریعے گوشت یا کسی چیز کے حصے حاصل کرتے۔ اس شغل میں ایسے ایسے جھگڑے کھڑے ہو جاتے کہ قبیلے کے قبیلے آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے۔ یہاں اس سے منع فرمایا۔

[7] تکمیلِ دین سے مراد اصل دین کی تکمیل ہے جس کا آغاز حضرت آدمؑ سے ہوا اور خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ کامل ہو گیا۔ اتمامِ نعمت سے مراد آخری شریعت کا اتمام ہے۔ اسی نعمت کا مجموعی نام اسلام ہے جو ہمیشہ سے اللہ کا دین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہودیت یا نصرانیت کو نہیں بلکہ اسی اسلام کو پسند فرمایا ہے۔

[8] آگے جواب سے واضح ہے کہ سوال میں اس شکار کا حکم پوچھا گیا جس کو سدھائے ہوئے جانور پکڑیں لیکن وہ ذبح کی نوبت آنے سے پہلے ہی دم توڑ دے۔

نے تم کو سکھایا تو تم ان کے اس شکار میں سے کھاؤ جو وہ تمہارے لیے روک رکھیں اور ان پر اللہ کا نام لے لیا کرو[9] اور اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ بہت جلد حساب چکانے والا ہے ۝ ۴

اب تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے اور شریف عورتیں مسلمان عورتوں میں سے اور شریف عورتیں ان اہل کتاب میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب ملی تمہارے لیے حلال ہیں[10]۔ بشرطیکہ ان کو قید نکاح میں لا کر ان کے مہر ان کو دو نہ کہ بدکاری کرتے ہوئے اور آشنائی گانٹھتے ہوئے اور جو ایمان کے ساتھ کفر کرے گا تو اس کا عمل ڈھے جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں ہوگا ۝ ۵

اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھو لو اور اپنے سروں کا مسح کر لو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھوؤ اور اگر حالتِ جنابت میں ہو تو غسل کر لو، اور اگر تم مریض ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آیا ہو یا عورتوں سے ملاقات کی ہو، پھر پانی نہ پاؤ تو پاک جگہ دیکھ کر اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کا مسح کر لو۔ اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی ڈالے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے[11] تاکہ تم اس کے شکر گزار ہو۔ ۝ ۶

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا، جب کہ تم نے

---

۹ یعنی کسی حلال جانور پر شکاری جانور اللہ کا نام لے کر چھوڑا جائے اور وہ اپنے شکار میں سے خود نہ کھائے بلکہ اسے مالک کے لیے روکے رکھے تو ایسا جانور طیب ہوگا، اگرچہ اسے ذبح نہ کیا جا سکا ہو۔

۱۰ حرام: حلال اور خبیث و طیب کی وضاحت کے بعد مسلمانوں کو اجازت دی کہ تم دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ حلت و حرمت کی حدود کی پابندی کے ساتھ معاشرتی تعلقات رکھ سکتے ہو۔ باعزت، شریف اور اچھے اخلاق کی کتابیہ خواتین سے نکاح کی اجازت بھی اس وقت دی ہے جب اسلام غالب قوت بن چکا تھا اور کتابیات سے نکاح میں خاندان کے دین و ایمان کے لیے خطرہ کا اندیشہ نہ تھا۔ کافرانہ ماحول میں اس قسم کا نکاح آیت کی روح اور اس کے موقع و محل کے خلاف ہے۔

۱۱ نماز باطن کی پاکیزگی کے لیے فرض کی گئی ہے لیکن ظاہر اور باطن میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ ظاہر کا اثر باطن پر اور باطن کا اثر ظاہر پر پڑتا ہے۔ نماز کے لیے وضو اور ناپاکی کی حالت ہو تو غسل اس باطنی طہارت کے حصول میں معین ہیں جو نماز کا اصل مقصود ہے۔ بیماری اور سفر وغیرہ کی حالت میں تیمم کی اجازت سے طہارت کے باب میں اللہ کی نعمت کا اتمام فرمایا۔ یہود کے ہاں طہارت کے معاملے میں بڑی سخت قیدیں اور پابندیاں تھیں۔ لہٰذا اس امت کو جو سہولتیں اور برکتیں عطا ہوئی ہیں ان پر ہر آن شکر واجب ہے۔

اقرار کر لیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی[12]۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ سینوں کے بھیدوں سے بھی باخبر ہے ۝ اے ایمان والو، عدل کے علم بردار بنو، اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم عدل نہ کرو[13]۔ عدل کرو۔ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے ۝ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے ۝ اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہی لوگ دوزخ والے ہیں ۝ اے ایمان والو، اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد کرو جب کہ ایک قوم نے ارادہ کیا کہ تم پر دست درازی کرے تو اللہ نے تم سے ان کے ہاتھ کو روک دیا[14]۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ ہی پر چاہیے کہ اہل ایمان بھروسہ کریں ۝ ۱۱

اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ہم نے ان میں سے بارہ نقیب مامور کیے[15] اور اللہ نے ان سے وعدہ کیا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز کا اہتمام رکھو گے، زکوٰۃ دیتے رہو گے، میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے، ان کی مدد کرتے رہو گے اور اللہ کو قرض حسن دیتے رہو گے تو میں تم سے تمہارے گناہ دور کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کر دوں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی پس جو اس کے بعد بھی

---

۱۲ یہ اتمام نعمت کا حق بتایا ہے کہ اللہ نے اپنی آخری اور کامل شریعت تم پر نازل کر کے جو فضل و انعام فرمایا ہے، یہود کی طرح اس کو بھول نہ جانا بلکہ ظاہراً و باطناً ہر پہلو سے اس کا حق ادا کرنا۔ سمع و طاعت کی ذمہ داری تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان ایک مضبوط میثاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ تمہارے لیے خدا نے دنیا و آخرت کے جو وعدے فرمائے ہیں وہ اسی میثاق کو پورا کرنے پر منحصر ہیں۔

۱۳ یعنی اس میثاق کے تحت مسلمانوں پر بحیثیت امت مسلمہ یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس حق و عدل کے علم بردار بنیں جو اس آخری شریعت کی شکل میں ان کو عطا ہوا ہے، خود اپنے اندر اس کو قائم کریں اور اسی کی شہادت دنیا کے سامنے دیں، کسی قوم کی دشمنی اور اس کا غلط سے غلط رویہ بھی انہیں اس حق و عدل سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

۱۴ مراد قریش ہیں جنہوں نے اسلام کی راہ روکنے کی پوری کوشش کی لیکن وہ مسلمانوں کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ فرمایا کہ اگر تم اسی طرح اپنے رب کے عہد و پیمان پر قائم رہے تو خدا ہر اس قوم کے مقابل میں تمہاری مدد فرمائے گا جو تمہارے مقابل میں سر اٹھائے گی۔

۱۵ نقیب کے معنی معاملات کی ٹوہ لگانے والا اور حالات کی جستجو کرنے والا کے ہیں۔ یہ نقیب یہود کی نگرانی کے لیے مقرر کیے گئے تاکہ وہ شریعت کے حدود و قیود کی پابندی کریں اور اللہ کے عہد سے روگردانی نہ کریں۔

تم میں سے کفر کرے گا تو وہ اصل شاہراہ سے بھٹک گیا[۱۶] ۝ پس ان کے اس عہد کو توڑ دینے کے سبب سے ہم نے ان پر لعنت کردی اور ان کے دلوں کو سخت کردیا۔ وہ کلام کو اس کے موقع و محل سے ہٹاتے ہیں اور جس چیز کے ذریعے سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی اس کا ایک حصہ وہ بھلا بیٹھے[۱۷] اور تم برابر ان کی کسی نہ کسی خیانت سے آگاہ ہوتے رہوگے۔ بس تھوڑے سے ان میں اس سے مستثنٰی ہیں۔ پس ان کو معاف کرو اور ان سے درگزر کرو۔ اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ۝ ۱۳

اور جو لوگ دعوی کرتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، ہم نے ان سے بھی عہد لیا تو جس چیز کے ذریعے سے ان کو یاد دہانی کی گئی وہ اس کا ایک حصہ بھلا بیٹھے تو ہم نے قیامت تک کے لیے ان کے درمیان عداوت اور بغض کی آگ بھڑکا دی[۱۸] اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں عنقریب اللہ اس سے ان کو آگاہ کریگا ۝ ۱۴

اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول وہ بہت سی باتیں ظاہر کرتا ہوا آگیا ہے جو تم کتاب کی چھپاتے رہے ہو اور وہ بہت سی باتیں نظر انداز بھی کررہا ہے۔ اب تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور ایک واضح کرنے والی کتاب[۱۹] آگئی ۝ اس کے ذریعے سے اللہ ان لوگوں کو جو اس کی خوشنودی

---

[۱۶] یہ اس عہد و میثاق کا بیان ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا۔ اس میں نماز کے اہتمام، زکوٰۃ کی ادائیگی، آئندہ آنے والے رسولوں پر ایمان اور ان کی تائید اور خدا کی راہ میں انفاق کا عہد لیا گیا اور اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنی معیت، ان کی عام لغزشوں سے درگزر اور ان کے لیے جنت کا وعدہ فرمایا۔ اس عہد سے انحراف کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

[۱۷] یہود کو تورات کے ذریعے سے یاد دہانی کی گئی تھی، اسی کے اندر میثاق الٰہی کا سارا ریکارڈ محفوظ کیا گیا تھا لیکن یہود کو اس کے جو احکام یا پیشینگوئیاں منشا کے خلاف نظر آئیں ان میں انہوں نے لفظی تحریفیں کرکے ان کا مفہوم بدل دیا، تاویل کے ذریعے سے بھی حقائق کی قلب ماہیت کی اور بعض چیزیں عام لوگوں سے چھپا دیں۔ اس نقضِ عہد کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یہود کو راندۂ درگاہ قرار دے دیا اور ان کے دلوں میں خشیتِ الٰہی ختم کردی۔

[۱۸] ملت کی شیرازہ بندی اللہ کے میثاق اور اس کی کتاب ہی سے ہوتی ہے۔ اس لیے نقضِ عہد کے بعد نصاریٰ فساد و اختلال سے دوچار ہوگئے۔ چونکہ انہوں نے قرآن مجید کی تعلیم کو تعصب کی بنا پر قبول نہ کیا لہٰذا ان کے اس جنگ و جدل سے نکلنے کا اب قیامت تک کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

[۱۹] قرآن مجید حکمت اور شریعت دونوں کا مجموعہ ہے۔ وہ ذہنی تاریکیوں سے بھی نکالتا ہے اور زندگی کے لیے عمل کی صحیح شاہراہ بھی متعین کرتا ہے۔ اس وجہ سے وہ نور بھی ہے اور کتاب مبین بھی۔

کے طالب ہیں سلامتی کی راہیں دکھا رہا ہے اور اپنی توفیق بخشی سے ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لا رہا ہے اور ایک صراطِ مستقیم کی طرف ان کی رہنمائی کررہا ہے ۝ ۱۶

بے شک ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا اللہ تو وہی مسیح ابن مریم ہے۔ پوچھو، کون اللہ سے کچھ اختیار رکھتا ہے اگر وہ چاہے کہ ہلاک کردے مسیح ابن مریم کو، اس کی ماں کو اور جو زمین میں ہیں ان سب کو۔[۲۰] اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کی بادشاہی۔ وہ پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۝ ۱۷

اور یہود و نصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں[۲۱]۔ ان سے پوچھو کہ پھر وہ تمہیں تمہارے جرموں پر سزا کیوں دیتا رہا ہے؟ بلکہ تم بھی اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق میں سے بشر ہو۔ وہ جسے چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا۔[۲۲] اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کی بادشاہی اور اسی کی طرف سب کو لوٹنا ہے ۝ ۱۸

اے اہل کتاب، تمہارے پاس ہمارا رسول رسولوں کے ایک وقفے کے بعد تمہارے لیے دین کو واضح کرتا ہوا آگیا ہے، مبادا تم کہو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور ہوشیار کرنے والا تو آیا ہی نہیں۔ دیکھ لو، ایک بشیر و نذیر تمہارے پاس آگیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۝ ۱۹

---

[۲۰] یہ نصاریٰ کے نقض عہد کی ایک مثال بیان ہوئی ہے کہ انہوں نے تمام عہد کی بنیاد — توحید — پر کلہاڑا رکھ دیا۔ اور اللہ تعالیٰ کے بجائے مسیح ابن مریم کو خدا بنا بیٹھے۔ مسیحیت حلول کے عقیدہ پر مبنی ہے اس عقیدہ کی رو سے مسیح کی شکل میں خدا ہی نے ظہور کیا۔ اس عقیدے کی تعبیر تثلیث سے کی گئی، جس میں مسیح، باپ اور روح القدس تینوں کو توحید میں شامل قرار دیا گیا۔ قرآن مجید نے کہیں اس گمراہی کی روح کو واضح کیا ہے اور کہیں اس کی معروف تعبیر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرمایا کہ کیا مسیح، کیا ان کی ماں اور کیا یہ ساری مخلوق۔ خدا سب سے بے نیاز اور مستغنی ہے کوئی نہیں جو اس کی بادشاہی میں اس کا شریک ہو۔

[۲۱] اہل کتاب کا یہی زعم باطل تھا جس نے ان کو عہدِ الٰہی کی ذمہ داریوں سے سب سے زیادہ بے پروا بنا دیا اور وہ اپنے آپ کو جنت کا پیدائشی حقدار سمجھنے لگے۔

[۲۲] یعنی خدا کے محبوب ہونے کے خبط سے نکلو، جس طرح خدا کی ساری مخلوق ہے اسی طرح تم بھی اسی کی مخلوق ہو۔ مغفرت اور عذاب خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ اگر کسی نے بزرگوں سے خاندانی نسبت یا ان کی موہوم شفاعت پر بھروسہ کرکے خدا کے عہد ہی کو توڑ دیا تو اس کو خدا کے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔

امین احسن اصلاحی

جبر و اختیار کا مسئلہ
فلسفہ اور قرآن کی روشنی میں (۲)

اختیار اور اس کی حدود :

اب ان لوگوں کے نقطۂ نظر کو لیجیے جو اختیار کے قائل ہیں۔ ان کے خیالات پر تنقید سے پہلے یہ امر ملحوظ رہنا چاہیے کہ زیرِ بحث یہ سوال ہے کہ انسان نیکی یا بدی اور خیر و شر کے جو راستے اختیار کرتا ہے کیا وہ اپنی صوابدید سے اختیار کرتا ہے یا ایک ڈگر پر ہانک دیا گیا ہے اور جس طرح جانور اپنی جبلت کے تحت چلتے ہیں اسی طریقے سے انسان بھی اس ڈگر پر چل رہا ہے۔ انسان کے لیے مطلق اختیار یہاں زیرِ بحث نہیں ہے۔ اس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ سائنسدانوں کو پہلے یہ زعم تھا کہ وہ اپنی تحقیقات کے زور پر کائنات کے سارے قوانین کا راز دریافت کر لیں گے اور بالآخر اس کائنات کے ماسٹر بن جائیں گے لیکن تحقیقات جوں جوں آگے بڑھتی گئی تو معلوم ہوا کہ اگر ایک گتھی سلجھتی ہے تو ہزاروں گرہیں اور پڑ جاتی ہیں۔ تحقیق اور تفتیش کا دائرہ بہت وسیع ہونے کے باوجود سائنسدان ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ بقول شاعر

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

جوگیوں اور صوفیوں نے بھی اس میدان میں طبع آزمائی کی۔ وہ بھی پانی پر چلنے، ہوا میں اڑنے، تمام طبعی قوانین اور زندگی و موت پر قابو پانے کے طریقے دریافت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس میں انہیں سراسر ناکامی ہوئی ہے۔ معلوم ہوا کہ انسان طبعی قوانین سے بالاتر نہیں ہو سکتا اور ان معاملات میں انسان کو اختیار بھی نہیں دیا گیا۔

جو فلسفی اختیار کے قائل ہیں وہ بھی انسان کے لیے مطلق اختیار کے قائل نہیں بلکہ ان کے نزدیک انسان کو نیکی و بدی کی راہ اختیار کرنے میں آزادی حاصل ہے۔ وہ اپنی صوابدید سے فیصلہ کرتا ہے کہ کیا چیز اس کے لیے

صحیح ہے اور کیا چیز غلط ہے۔

اس سلسلہ میں یہ سوال قابلِ غور ہے کہ کیا انسان خیر و شر کو اختیار کرنے میں پوری طرح آزاد ہے، اس پر خارج سے کوئی قدغن، پابندی یا رکاوٹ ہے یا نہیں؟ وہ خیر و شر کا ارادہ کر لے تو کیا اس پر قادر ہے کہ اس کو لازماً پورا کر لے؟ اس بارے میں عملاً دیکھا گیا ہے کہ آپ اگر خیر و شر کا ارادہ کر لیں تو اس کی راہ میں ہزاروں رکاوٹیں پیش آئیں گی اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ان خارجی اور داخلی رکاوٹوں سے شکست کھا کر ہمت ہار بیٹھیں اور اپنے ارادہ ہی سے دست کش ہو جائیں۔ تاہم اس سے انسان کے ارادہ کی نفی نہیں ہوتی بلکہ یہ رکاوٹیں ارادہ کے امتحان کے لیے ہوتی ہیں اور ان سے ارادے کی قوت یا ضعف ظاہر ہوتا ہے لیکن اگر ارادوں کی تکمیل میں کامیابی نہیں ہوتی تو یہ بھی محض اتفاق نہیں ہے بلکہ ایسا سنتِ الٰہی کے تحت ہوتا ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص ضابطہ مقرر کر دیا ہے جو ہم آگے واضح کریں گے جہاں تک ارادہ کرنے اور اس کے لیے جد و جہد اور تدابیر اختیار کر کے اس کو بروئے کار لانے کا سوال ہے تو اس کا انحصار خدا کی حکمت اور مصلحت پر ہے۔ چونکہ کائنات میں ثنویت نہیں ہے اس لیے مشیتِ الٰہی ہر چیز پر غالب ہے۔

اختیار میں عقل کی نارسائی کی مشکل :

اختیار کے قائل فلسفی یہ کہتے ہیں کہ اگر انسان کو آزادی حاصل ہے تو اس کے لیے اس کو قدم قدم پر عقل کی رہنمائی کی ضرورت ہوگی۔ اس لحاظ سے عقل کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ وہی بتائے گی کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا اور ارادہ کو بروئے کار لانے کے لیے کون سی تدبیر اختیار کی جائے اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ارسطو، افلاطون، کانٹ، روسو اور دوسرے بڑے بڑے فلسفی عقل کو مرشدِ کامل نہیں مانتے وہ اس کی کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ عقل جذبات اور خواہشات سے مغلوب ہو جاتی ہے اور دور تک مستقبل میں نہیں جھانک سکتی۔ ان کے یہ اعتراضات بالکل درست ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ عقل بسا اوقات جذبات اور خواہشات کی وکیل بن جاتی ہے۔ اسی لیے روسو نے عقل کو مردار کتیا سے تعبیر کیا ہے۔ عقل باطل سے باطل چیز کی حمایت میں پورا فلسفہ کھڑا کر دیتی ہے۔ اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے رہنما پر انسان کیسے اعتماد کر سکتا ہے؟ اگر ایسے رہنما کے اعتماد پر انسان کے ہاتھ میں اختیار اور آزادی کی لگام پکڑا دی گئی ہے تو یہ نادان کے ہاتھ میں تلوار نہیں بلکہ پاگل کے ہاتھ میں بم ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ انسان کی عقل میں جو خلا ہے اس کا کوئی نہ کوئی علاج بتایا جائے۔ لیکن تمام بڑے فلسفیوں نے عقل کی خامیوں کی نشاندہی کرنے کے باوجود اس کو کافی سمجھا ہے۔

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے وہ عقل کے خلا کو تسلیم کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اس کا علاج وحی الٰہی ہے۔ زندگی کے مختلف گوشوں میں انسان کی رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبوت کا سلسلہ شروع کیا۔ بعد میں اہل مذہب نے اس رہنمائی کو بھی مسخ کرکے رکھ دیا اس لیے لازم ہوگیا کہ انسان کو ایک نبی کامل کی ایسی رہنمائی حاصل ہو جو بالکل محفوظ ہو۔ یہ رہنمائی قرآن مجید میں محفوظ ہے۔

قرآن مجید عقل کو معتوب قرار نہیں دیتا بلکہ اس کو رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اس نے زندگی کے مختلف دائروں میں حدود متعین کر دیے ہیں اور عقل کو ان حدود کے اندر غور کرنے کی پوری آزادی دے دی ہے۔ یہ حدود یا بنیادی حقیقتیں بدیہیات میں سے ہیں جن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ ان تک رسائی کے لیے بہت زیادہ غور وفکر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً خدا کا ماننا، عدل کا خیر ہونا، صداقت کا حسن ہونا، رحم کا ایک اعلیٰ صفت ہونا، ظلم و زیادتی اور حق تلفی کا گناہ ہونا وغیرہ۔

پس مذہب کی رو سے یہ ضروری ہے کہ آپ عقل کو پوری آزادی کے ساتھ خدا کی بتائی ہوئی حدود کے چاروں گوشوں کے اندر استعمال کریں کیونکہ اگر ان گوشوں کے اندر عقل کو استعمال نہیں کریں گے تو پھر گمراہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ اسی لیے وحیٔ الٰہی نے ان دونوں خطروں سے انسان کو محفوظ کر دیا ہے تاکہ انسان اپنی فطرت کے مطابق زندگی بسر کرسکے۔

جبر کے حق میں عیسائی متکلمین کا استدلال:

متکلمین کا طرز استدلال فلسفیوں سے مختلف ہوتا ہے۔ فلسفی اپنے استدلال کی بنیاد عقل پر رکھتے ہیں لیکن متکلم حضرات اپنے مذہب کے وکیل اور ترجمان ہوتے ہیں۔ وہ جس مذہب کے پیرو ہوتے ہیں اسی مذہب کی وکالت کرتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا مذہب عقل کے مطابق ہے۔ فلسفیوں کی باتیں اگر مذہب کے خلاف جاتی ہوں تو انہیں اس کی پروا نہیں ہوتی لیکن متکلم حضرات خواہ کتنی ہی گمراہی کی باتیں کریں وہ مذہب کے دامن کو پکڑے رہتے ہیں۔ عیسائیوں کے اندر جو علم کلام وجود پذیر ہوا اس کی ترجمانی کے سلسلے میں سینٹ آگسٹائن کو منتخب کرتا ہوں۔ یہ پانچویں صدی کے وسط کا آدمی ہے۔ اس کو عیسائیوں میں وہی مقام حاصل ہے جو ہمارے ہاں امام غزالی اور امام رازی کو حاصل ہے۔ موجودہ عیسائیت کا حقیقی ترجمان وہی ہے۔ اس کی بنیاد جبر کے عقیدہ پر ہے۔ اس کا کہنا ہے "جب خدا نے آدم کو پیدا کیا تو اول اول اس کو ارادہ اور اختیار کی آزادی بخشی لیکن آدم نے گناہ کا راستہ اختیار کیا جس کی پاداش میں نہ صرف آدم بلکہ اس کی تمام ذریت اس نعمت سے محروم کردی گئی۔ اب تمام انسان شر کے غلام اور گناہ کی زندگی

بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے بعض انسانوں کو نجات کے لیے منتخب کر لیتا ہے اور دوسروں کو ان کے گناہ کی پاداش میں عذاب میں ڈال دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا انتخاب سرتاسر اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ انسان کے اعمال اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔"

اس عقیدہ کا پہلا حصہ گناہ سے متعلق ہے جس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کرنے کے بعد جنت کی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی تھی لیکن ایک درخت کا پھل کھانے سے منع کر دیا تھا۔ آدم نے وہ پھل کھا لیا تو اس گناہ کی پاداش میں وہ اختیار کی آزادی سے محروم ہوگئے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آدم کا یہ گناہ پوری ذریت کے ساتھ چپکا ہوا ہے۔ اس لیے اب تمام انسان شر کے غلام اور گناہ کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ ان کے لیے نجات کی واحد صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اپنے فضل سے نجات کے لیے منتخب کر لے جن کو وہ منتخب کر لے گا صرف وہی نجات پائیں گے، باقی تمام جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔ اس کا آخری پہلو یہ ہے کہ اس انتخاب کا تمام تر انحصار اللہ تعالیٰ کی اپنی صوابدید پر ہے۔ اس میں انسان کے اپنے اعمال کو کوئی دخل نہیں۔

آدم کے گناہ کی نوعیت:

عقلی اصولوں پر اگر اس تقریر کو پرکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان لوگوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے متعلق تصور بالکل عامیانہ اور طفلانہ ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے عام بادشاہوں اور حکمرانوں کی طرح اللہ تعالیٰ بھی تجربات کے مراحل سے گزر کر سیکھتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سوچے سمجھے بغیر اختیار کی تلوار آدم کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ اسے شروع میں یہ اندازہ نہیں ہوا کہ آدم کیا کر بیٹھے گا لیکن جب آدم نے غلطی کی تو گھبرا کر صرف آدم ہی سے نہیں بلکہ تمام ذریت آدم سے اختیار چھین لیا۔ یہ تصور انسان کی عقل و فطرت کے خلاف ہے۔ اگر خدا کو بھی تجربات (TRIAL & ERROR) کے مرحلہ سے گزرنا پڑے تو پھر وہ خدا کیا ہوا! خدا کے علم کے لیے ضروری ہے کہ یہ محیط کل ہو۔ وہ دنیا کے وجود میں آنے سے لے کر خاتمہ تک اس کی ہر چیز کو جانتا ہو۔ عقل کا تقاضا یہی ہے لیکن عیسائی متکلمین کا تصور یہ ہے کہ خدا نے یوں ہی بے سوچے سمجھے ایک کام کر دیا تھا اس کے بعد جب تجربہ ہوا تو آدم اور اس کی ذریت سے سارے اختیارات چھین لیے۔ ظاہر ہے کہ یہ فلسفہ خدا کی اعلیٰ صفات کے منافی ہے۔

قرآن مجید نے آدم کے واقعہ کو نہایت پرحکمت طریقہ سے بیان کیا ہے جو عقل کے بالکل مطابق ہے اور طبیعت اس کو قبول کرتی ہے۔ قرآن کا بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کرنے کی پوری اسکیم کے تمام مضمرات

پہلے ہی واضح کر دیے تھے اور کوئی چیز مخفی نہیں رکھی تھی جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے اپنی اس اسکیم کا ذکر کیا کہ میں زمین میں خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں تو خلیفہ کے لفظ سے فرشتے سمجھ گئے کہ اس کو ایک خاص دائرے میں اختیارات حاصل ہوں گے جن کو وہ غلط طور پر بھی استعمال کر سکتا اور برائی کا راستہ کھول سکتا ہے۔ اس لیے فرشتوں نے سوال کیا کہ زمین میں خلیفہ بنانے کا کیا مقصد ہے کیونکہ اندیشہ ہے کہ انسان زمین میں خون ریزی اور فساد مچائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو مطمئن کرنے کے لیے ان کے سامنے اپنی ساری اسکیم بیان کی اور بتایا کہ دنیا میں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا جائے گا۔ آدم کی ذرّیت میں گناہ گار اور مجرم ہی نہیں پیدا ہوں گے بلکہ ان میں انبیاء و رسل بھیجے جائیں گے، صالحین، مجددین اور ابرار و اخیار بھی پیدا ہوں گے۔ اس سے فرشتوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ اگر آدم کو اختیار دے رہا ہے تو اس کے لیے ہدایت، تربیت اور اصلاح کا اہتمام بھی کرنے والا ہے اور جب یہ اہتمام ہو گا تو پھر انسان کا احتساب بھی ہو گا۔ اس لیے اعتراض کی کوئی وجہ نہیں۔ البتہ یہ بات انصاف کے خلاف ہوتی کہ محض اس اندیشہ کی بنا پر کہ آدم کی ذرّیت میں گمراہی پھیلانے والے لوگ بھی پیدا ہوں گے، پوری انسانیت کو خدا کی خلافت کا حق ادا کر کے ابدی بادشاہی کا مقام حاصل کرنے کے حق سے محروم کر دیا جاتا۔ چنانچہ فرشتوں نے خدا کے سامنے یہ اعتراف کر لیا کہ تو علیم و حکیم ہے اور تیرا ہر کام حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔

آدم کی توبہ سے عیسائیوں کا اغماض:

سینٹ آگسٹائن اور دوسرے عیسائی متکلمین کو حضرت آدم کے گناہ کا علم تو ہے جس کو مان کر انہوں نے پوری نسل آدم کے جہنم میں جھونک دیے جانے کی خبر دی لیکن ان کو اس کی خبر نہیں کہ آدم نے توبہ کر لی تھی اور اسے خداوند تعالیٰ نے قبول فرما لیا تھا۔ یہ لوگ اس کا یہ عذر پیش کر سکتے ہیں کہ تورات میں صرف گناہ کا ذکر ہے اور توبہ کا ذکر نہیں لیکن یہ عذر معقول نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ اگر حضرت آدمؑ کو نبی نہ بھی تسلیم کریں تب بھی انہیں یہ بات سوچنی چاہیے کہ حضرت آدمؑ بہشت میں اللہ تعالیٰ کے معزز مہمان کی حیثیت سے تھے ان سے غلطی صادر ہوئی تو ان پر تنبیہ بھی کی گئی ہوگی۔ اس لیے یقین نہیں کہ حضرت آدم کو توبہ کی یاد دہانی نہ فرمائی گئی ہو لہٰذا انہوں نے ضرور توبہ کی ہوگی۔ تورات میں اگرچہ حضرت آدم کی توبہ کا ذکر نہیں ہے، لیکن ہابیل اور قابیل کا قصہ تو موجود ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس آدم کی صلب سے ہابیل جیسا فرزند پیدا ہوتا ہے جو اپنے کردار اور اپنے تقویٰ کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کا آدمی ہے اور دین کے تمام بنیادی حقائق سے واقف ہے، وہ خود

اتنا غبی کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ بھی نہ جان سکے کہ وہ اپنی غلطی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عتاب میں آ جائے گا اور جب عتاب میں آ جائے تو اس کے وبال سے نکلنے کے لیے اپنی غلطی پر ندامت کا اظہار کر کے توبہ بھی نہ کرے۔ یہ بات سینٹ آگسٹائن ہی خیال کر سکتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔

تورات کے مرتبین نے اگرچہ توبہ کے واقعہ کو نہیں لیا لیکن قرآن مجید نے اس کا ذکر بڑے شاندار طریقہ سے کیا ہے اور بتایا ہے کہ آدم کی طلب پر توبہ کے کلمات اللہ تعالیٰ نے القا کیے:

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ

پھر آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے۔

(البقرہ ۲ : ۳۷)

جس کے بعد آدمؑ نے ان الفاظ میں توبہ کی:

رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ

اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا اور اگر تو ہمیں معاف نہ کرے گا اور ہم پر رحم نہ فرمائے گا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

(اعراف ۷ : ۲۳)

اس توبہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم کا گناہ معاف کر دیا۔ لہٰذا آدم کو زمین میں لعنت کے طور پر نہیں بھیجا گیا جیسا کہ سینٹ آگسٹائن سمجھتے ہیں بلکہ یہ بھیجا جانا اسی اسکیم کے تحت تھا جو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے پہلے ظاہر کی تھی۔ چنانچہ زمین پر جانے کا حکم ان الفاظ میں دیا گیا:

اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰۤئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

اب تم سب زمین میں جاؤ۔ اگر میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئے تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو ان کے لیے نہ کوئی اندیشہ ہو گا اور نہ وہ غم کھائیں گے اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہ دوزخ والے ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

(البقرہ ۲ : ۳۸-۳۹)

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں دنیا لعنت کا گھر نہیں بلکہ امتحان کی جگہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایت یہاں نازل ہوگی جو اس ہدایت کی پیروی کریں گے وہ امتحان میں کامیاب قرار دیے جائیں گے اور جنت کے حق دار ٹھہریں گے اور جو اس امتحان میں فیل ہو جائیں گے وہ دوزخ میں ڈال دیے جائیں گے۔

عیسائی متکلمین اگر یہ کہیں کہ انسان گناہ کرنے کے بعد توبہ کر کے بھی معتوب رہتا ہے تو وہ غلط کہتے ہیں۔ سیدنا مسیحؑ نے توبہ کی عالی مقامی کا نہایت شاندار الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ توبہ کرنے کے بعد انسان کا مقام پہلے سے بھی بلند ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اس کو ایک مثال سے سمجھایا ہے کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ اگر ایک گڈریے کی بھیڑ گم ہو جاتی ہے تو وہ سارے گلے کو چھوڑ کر اس کی تلاش میں ندی نالوں کے کنارے کنارے پھرتا اور جب بھیڑ مل جاتی ہے تو اس کو اپنے کندھے پر اٹھا کر اپنے گلے کی طرف لاتا ہے اور جب اپنے آدمیوں میں پہنچتا ہے تو کہتا ہے کہ لوگو خوشی مناؤ کہ میری کھوئی ہوئی بھیڑ مل گئی۔ اسی طریقہ سے جب کوئی بندہ گناہ کر کے بھٹکنے کے بعد خدا کی طرف رجوع کرتا ہے تو تمہارا رب خوشی مناتا ہے اور فرشتوں سے کہتا ہے کہ تم بھی خوشی مناؤ کہ میرا بھٹکا ہوا بندہ پھر میرے راستہ پر آ گیا ہے۔

اولادِ آدم پر بارِ گناہ کیوں :

اب اس مسئلہ کو لیجیے کہ باپ کے گناہ کی ذمہ داری قیامت تک اس کی اولاد پر ہوگی۔ یہ بات بالکل خلافِ عقل ہے اس لیے کہ اولاد پر ان گناہوں کی ذمہ داری ہونی چاہیے جن میں وہ اپنے باپ کی پیروی کریں۔ اور جن پر وہ فخر کریں۔ اگر اولاد نہ صرف یہ کہ ان گناہوں کی پیروی نہ کرے بلکہ اس موقع پر موجود بھی نہ ہو جہاں گناہ ہوا ہو تو پھر اس کی ذمہ داری اولاد پر نہیں ہو سکتی۔ حضرت آدم سے جس وقت گناہ ہوا تھا اس وقت ان کی بیوی کا موجود ہونا تو معلوم ہے لیکن ذرّیت کے موجود ہونے کا کوئی علم نہیں۔ اگر ذرّیت وہاں شریک گناہ بھی نہیں تھی، اس سے واقف بھی نہیں تھی اور ان کی اندھی مقلد بھی نہیں رہی تو پھر ذرّیت پر آدم کے گناہوں کی ذمہ داری کیسے ڈالی جا سکتی ہے ؟

نجات کے لیے اعمالِ صالحہ ضروری ہیں :

عیسائی متکلمین کے نقطۂ نظر کا اس سے بھی زیادہ خطرناک پہلو یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اب انسان کی نجات کا تمام تر انحصار اللہ تعالیٰ کی صوابدید پر ہے۔ اس میں بندے کے عمل کو کوئی دخل نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہر چیز خدا کی مرضی اور اس کے فضل سے ہوتی ہے لیکن یہ بات بالکل غلط ہے کہ خدا کے فضل کو حاصل کرنے اور اس کی عنایت کو جذب کرنے میں انسان کے عمل کا کوئی دخل نہیں۔ اس بیان کا ایک حصہ درست اور دوسرا بالکل غلط ہے۔ کیونکہ اگر خدا کے فضل کو حاصل کرنے کے لیے انسان کے عمل کا کوئی دخل نہ ہو تو انسان پر ایسی مایوسی طاری ہو جاتی ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ انسان کیوں اچھے عمل کرے ؟ حضرت مسیحؑ

نے لوگوں کو ایسے موثر الفاظ میں عمل کی تلقین فرمائی ہے کہ سنگ دل سے سنگ دل آدمی کے دل پر بھی اثر کرتی ہے تو اس کا کیا مقصد ہے ؟ سیدنا مسیحؑ سے ایک دولت مند نے پوچھا کہ میں اپنے رب کی رضا حاصل کرنے کے لیے کیا کروں تو انہوں نے کہا کہ تو اپنا مال خدا کی راہ میں لٹا دے اور میرے ساتھ ہو جا۔ ظاہر ہے یہ انہوں نے اس وجہ سے کہا تھا کہ یہ عمل اس کے کام آئے گا۔ سیدنا مسیحؑ سے کسی نے پوچھا کہ نیکی کا سب سے بڑا کام کیا ہے تو انہوں نے کہا کہ تو اپنے خداوند کو پورے دل اور پوری جان سے مان۔ اس نے پوچھا کہ اس کے بعد؟ تو آپ نے کہا کہ پڑوسی سے نیکی کر۔ یہاں تک فرمایا کہ تیرا بھائی اگر تیرا جوتا مانگے تو اپنی قمیص بھی اتار کر دے دے۔ سوال یہ ہے کہ سیدنا مسیحؑ نے یہ تعلیمات کس لیے دی ہیں۔ اسی لیے تو دی ہیں کہ اس سے خدا کی رضا حاصل ہوگی، خدا کا فضل حاصل ہوگا۔ یعنی ہم اپنے نیک اعمال کے ذریعے خدا کی رضا کو اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں۔

عیسائیوں کا کفارہ کا عقیدہ :

عیسائی متکلمین کے یہاں اس کا کوئی تصور نہیں کہ انسان اپنے اعمال کے ذریعہ خدا کی رضا کی توقع رکھ سکتا ہے۔ اس لیے اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ لوگوں میں سخت مایوسی پھیل گئی کہ جب وہ خدا کی عبادت کر رہے ہیں، انسانوں کے حقوق ادا کر رہے ہیں تب بھی خدا ان سے غیر متعلق ہے تو کہاں جائیں اور کیا کریں ؟ انہوں نے اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے میں اس سے بھی بڑی غلطی کر ڈالی۔ انہوں نے کہا کہ خداوند نے جب یہ دیکھا کہ اولادِ آدم کی نجات کا کوئی راستہ نہیں رہا تو اس نے اپنے بیٹے کو دنیا میں بھیجا کہ وہ سولی پر چڑھ جائے، اس طرح عیسائیوں نے ایک ایسا دروازہ کھول دیا جس کے بعد نجات کے لیے کسی عمل کی ضرورت باقی نہیں رہی، صرف حضرت عیسیٰ کو مان لینا کافی ہے۔ یہ عقیدہ خود حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کی نفی کر دیتا ہے اور عقل سے بھی اس کو کوئی تعلق نہیں۔ غور کیجیے کہ یہ کتنی مہمل بات ہے کہ گناہ تو کیا آدم نے لیکن اس کا بار ان کی پوری ذرّیت پر آن پڑا۔ پھر آدم اور اولادِ آدم کے بارِ گناہ کا کفارہ خود اللہ میاں کو بھگتنا پڑا۔ گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ آدم کی تخلیق کے نتائج دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے اپنے بیٹے ہی کو قربان کر دیا۔

اب ایک سوال یہ ہے کہ کیا حضرت عیسیٰؑ سولی پر چڑھائے بھی گئے تھے یا نہیں ؟ یہ کفارہ تو اسی صورت میں نہیں گے جب سولی ثابت ہو۔ اگر سولی ہی ثابت نہ ہو تو پھر کفارہ کیا ہوا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ نجات کی یہ امید بھی غلط دلائی گئی۔

حضرت عیسیٰؑ کے سولی کے واقعہ سے قرآن مجید نے صاف صاف انکار کیا ہے۔ فرمایا :

مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ   انہوں نے قتل کیا نہ سولی دی بس یہ ہے کہ

شُبِّهَ لَهُمْ — ان کو شبہ میں ڈال دیا گیا۔

(النساء ۴: ۱۵۷)

انجیلوں سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ کو پھانسی نہیں دی گئی وہاں بیان ہوا ہے کہ اس واقعہ کے بعد حضرت عیسیٰ تیسرے دن اپنے شاگردوں کے پاس اچانک پہنچ گئے اور یہ وہ طریقہ ہے جو وہ اس سے پہلے بھی اختیار کرتے رہتے تھے۔ ان کی آمد سے شاگرد حیران رہ گئے انہوں نے سمجھا کہ مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے کے بعد یہ ان کی روح آگئی ہے۔ حضرت عیسیٰ نے ان کی حیرت دیکھتے ہوئے کہا کہ گھبراؤ نہیں، میں روح نہیں ہوں، میں حقیقی عیسیٰ ہوں لیکن لوگوں کو یقین نہیں آیا۔ اس پر سیدنا مسیح نے کہا کہ اچھا تمہارے پاس کوئی چیز کھانے کو ہے؟ تو انہیں مچھلی کا قتلہ دیا گیا۔ انہوں نے اس کو کھا کر دکھایا اور کہا کہ روح کھاتی نہیں۔ چونکہ تورات میں یہ عقیدہ موجود ہے کہ روح کھاتی نہیں اس لیے صلیب کے واقعہ کے تین روز بعد حضرت عیسیٰ کا شاگردوں کے پاس آنا روحانی شکل میں نہیں بلکہ جسمانی شکل میں تھا اور پھانسی کا واقعہ ان سے غلط طور پر منسوب کیا گیا ہے۔

مزید برآں تاریخی شواہد اس بات کے حق میں ہیں کہ رومیوں کی حکومت کا حضرت عیسیٰ کو پھانسی دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا وہ اس سے گریز کرنا چاہتے تھے البتہ یہودی زور لگا رہے تھے کہ ان کو سولی دی جائے حکومت نے یہودیوں کو بے وقوف بنانے کے لیے کسی قیدی کو پھانسی پر لٹکا دیا اور مشہور کر دیا کہ ہم نے عیسیٰ کو پھانسی دے دی ہے۔ آج کے دور میں بھی اس سلسلہ میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سولی کے واقعہ کو تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ اس کو افسانہ (۲/۱۸۷ ع.م) قرار دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفارہ کے عقیدہ کی بنیاد ہی غلط ہے۔

قرآن مجید نے انسان کی نجات کے لیے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ انسان خود اس کے لیے کوشش کرے اس کے پاس جو طاقت اور قوت ہے، جو تدبیر اور جو صلاحیت ہے اس کو خدا کے راستہ میں ڈال دے تو خدا اپنے فضل و کرم سے اس کی اس کوشش میں برکت عطا فرمائے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ تو کچھ پیش کرنے کے لیے تیار نہ ہوں اور خدا آپ کی کامیابی کے لیے راستہ ہموار کر دے۔ اس معاملہ کو بھی سیدنا مسیح نے نہایت عمدہ مثال سے سمجھایا۔ انہوں نے فرمایا کہ جو لوگ خدا کی نعمتوں یعنی سمع و بصر، عقل و فواد کی صلاحیتوں کی قدر نہیں کرتے تو ان کو مزید دینا تو درکنار خدا ان سے وہ نعمت بھی چھین لیتا ہے جو فطری طور پر ان کو دی گئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص دھیلوں میں چور ثابت ہو، اشرفیاں اس کی امانت میں کیسے دی جا سکتی ہیں؟ پس عیسائی متکلمین کی یہ بات کہ خدا کے فضل کو حاصل کرنے میں انسان کے عمل کو کوئی دخل نہیں بالکل بے بنیاد اور بے سروپا ہے اور قرآن مجید کی یہ بات صحیح ہے کہ اللہ کا فضل انسان کے اعمال پر مترتب ہوتا ہے۔

جبر و اختیار کے بارے میں مسلمان متکلمین کی آراء:

مسلمانوں میں متکلمین کے بہت سے گروہ ہوئے ہیں مثلاً مرجئہ، ماتریدیہ، اشاعرہ اور معتزلہ وغیرہ، لیکن اشاعرہ کے سوا باقی تمام گروہ اب باقی نہیں رہے۔ معتزلہ کا نام ہی معروف ہے۔ ان کے اقوال دوسروں کے حوالے سے ملتے ہیں۔

متکلمین کے یہ گروہ عباسیہ کے دور میں پیدا ہوئے کیونکہ اس دور میں فلسفیوں کی کتابوں کے ترجمے ہوئے اور مختلف مذاہب کے لوگوں سے مناظرے ہوئے۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے بھی مختلف گروہ پیدا ہو گئے۔ اشاعرہ کا مذہب عباسیوں کی جابرانہ حکومت کے لیے بہت موزوں تھا کیونکہ جو حکومت جبر پر قائم ہو وہ اس بات کو پسند کرتی ہے کہ لوگوں کا یہ عقیدہ ہو کہ چند چیزوں کو مان لو اور پھر چپ رہو کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کرتا ہے اس کی تقدیر میں کسی کو دخل نہیں۔ چنانچہ اس دور میں اشاعرہ کے مذہب کو بہت فروغ ہوا۔

جبر و اختیار کے معاملہ میں اشاعرہ کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل جائز ہے کہ انسان پر اس چیز کی ذمہ داری ڈال دے جو اس کی طاقت سے باہر ہو، اس کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ بندوں کی مصلحت کے مطابق کام کرے بلکہ وہ جو چاہے کرے۔ امام غزالی اشاعرہ کے امام ہیں انہوں نے کہا ہے کہ خدا کو یہ حق ہے کہ وہ کسی جرم کے بغیر مخلوق کو عذاب دے۔ امام رازی بھی جو اشاعرہ کے خاتم الائمہ ہیں تفسیر کبیر میں ہاروت ماروت کے قصہ کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ آدمی کے اعمال میں اس کے اختیار کو کوئی دخل نہیں۔ کافر کا کفر اور گنہگار کا گناہ خدا نے خود چاہا ہے۔

اس کے مقابلہ میں معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ خدا کسی محال بات کا حکم نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے عدل و انصاف کرنا واجب ہے۔ وہ نیکی کے بدلے میں عذاب اور گناہ کے بدلے میں ثواب نہیں دے سکتا۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو یہ ظلم اور ناانصافی ہے۔

معتزلہ کے دلائل کا جائزہ:

اس میں شبہ نہیں کہ معتزلہ کا مذہب عقل سے قریب ہے لیکن سواد اعظم کا مذہب اشاعرہ ہی کا مذہب ہے اور دینی مدارس میں بھی یہی پڑھایا جاتا ہے۔ معتزلہ کے مذہب میں ایک ایسا سقم ہے کہ اگر اس کو دور نہ کیا جائے تو وہ شرک کی راہ پر لے جاتا ہے مثلاً وہ یہ کہتے ہیں کہ انسان خود مختار مطلق ہے۔ اگر مختار مطلق سے ان کی مراد یہ ہے کہ اس اختیار پر خدا کی مشیت کسی پہلو سے بھی اثرانداز نہیں ہوتی تو یہ کسی طرح بھی درست

نہیں۔ اس سے ثنویت لازم آتی ہے کیونکہ مطلق ارادہ تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہو سکتا ہے کوئی دوسرا ارادہ ایسا نہیں ہو سکتا جو خدا کی مشیئت کے تابع نہ ہو۔ اگر کوئی دوسرا ارادہ بھی مطلق مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یزداں اور اہرمن دو الگ الگ قوتیں ہیں۔ اس طرح دوئی لازم آتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں شرک لازم آتا ہے۔

معتزلہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ اختیار تو خدا ہی کا دیا ہوا ہے تو اس سے اس کی مشیت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ لیکن یہ جواب کمزور ہے کیونکہ خدا نے کسی کو بھی ایسی آزادی نہیں دی جس پر اس کی مشیئت حکمران نہ ہو۔ آپ کو جو اختیار حاصل ہے وہ یہ ہے کہ آپ ایک چیز کا انتخاب کر سکتے ہیں، اس کو پسند کر سکتے ہیں، اس کے لیے جد و جہد کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کا نتیجہ آپ کے اختیار میں نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ یہ بات عقلی طور پر بھی صحیح ہے اور عملاً بھی صحیح ہے۔ آپ نیک سے نیک ارادہ کرتے ہیں۔ اس کے لیے منصوبہ بناتے ہیں، سرمایہ فراہم کرتے ہیں، اس کو پورا کرنے کے لیے جد و جہد کرتے ہیں لیکن جب دو چار ہاتھ لب بام رہ جاتا ہے تو کمند ٹوٹ جاتی ہے۔ اسی طرح کوئی شخص برے سے برا ارادہ کرتا ہے۔ زندگی بھر اس کے لیے اسکیمیں بناتا ہے اور اقدام کر گزرتا ہے لیکن اپنے ارادہ میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ اس لیے آپ کو جو اختیار حاصل ہے وہ کوشش کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اس کوشش کی راہ میں کوئی فطری اور طبعی رکاوٹ نہیں ہے لیکن اس کا نتیجہ آپ کے اختیار میں نہیں، وہ خدا کی مشیئت کے تابع ہے۔ اس لیے انسان کی آزادی کے یہ معنی نہیں کہ وہ خدا کی مشیئت سے بھی آزاد ہے۔ آخر خدا نے انسان کو بندہ بنایا ہے خدا نہیں بنایا۔

اشاعرہ کے دلائل کا جائزہ:

اشاعرہ کو جو غلط فہمی ہوئی ہے وہ جبر کے ساتھ لفظ قدر سے ہوئی۔ قدر کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز پیش آنے والی ہے وہ خدا نے پہلے ہی سے لکھی ہوئی ہے۔ اس لیے انسان کے پاس کوئی اختیار نہیں۔ اگر ایک شخص کے متعلق یہ مقدر ہے کہ وہ جہنم میں جائے گا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ جنت میں جائے اور جس شخص کا مقدر یہ ہے کہ وہ جنت میں جائے تو وہ کس طرح دوزخ میں جا سکتا ہے؟ اشاعرہ کا کہنا ہے کہ خدا جو بات جانتا ہے اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس طرح خدا کے علم کی نفی لازم آتی ہے۔

اشاعرہ نے یہ بات سمجھنے میں بڑی غلطی کی ہے کیونکہ اگر خدا یہ جانتا ہے کہ فلاں شخص دوزخ میں جائے گا تو خدا یہ بھی جانتا ہے کہ یہ شخص اپنے ارادہ کی آزادی کے ساتھ فلاں فلاں جرائم کرے گا جس کے نتیجہ میں جہنم میں جائے گا۔ علیٰ ہذا القیاس یہ بھی ممکن ہے کہ خدا کسی شخص کے متعلق یہ جانے کہ وہ نیکی کے فلاں فلاں کام کرے گا جس کی وجہ سے وہ جنت میں جائے گا۔ ایسا ماننے سے خدا کے علم کی نفی نہیں ہوگی۔ اس لیے اس معاملہ میں اشاعرہ نے جو

غلطی کی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اصل موثر خدا کے علم کو مانا ہے حالانکہ اصل موثر آدمی کے اپنے اعمال ہیں۔ قرآن مجید میں فرمایا ہے:

إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ

(اللیل ۹۲: ۴-۱۰)

تمہاری کمائی الگ الگ ہے سو جس نے اللہ کی راہ میں دیا اور پرہیزگاری اختیار کی اور اچھے انجام کو سچ جانا اس کو تو ہم اہل بنائیں گے راحت کی منزل کا اور جس نے بخالت کی اور بے پروا ہو بیٹھا اور اچھے انجام کو جھٹلایا اس کو ہم ڈھیل دے دیں گے کٹھن منزل کے لیے۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو شخص نیکی کا راستہ اختیار کرے گا وہ جنت میں جائے گا اور جو برائی کا راستہ اختیار کرے گا وہ دوزخ میں جائے گا۔ ان آیات میں جنت اور دوزخ کو اچھے یا بُرے اعمال کے ساتھ مشروط کیا ہے۔

دوسرا مغالطہ اشاعرہ کو یہ پیش آیا کہ قرآن مجید میں جن افعال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے، بعض اوقات مطلق طریقے سے کی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا:

يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا

(البقرہ ۲: ۲۶)

وہ اس سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے۔

ایسی آیات کو سمجھنے میں انہوں نے یہ غلطی کی کہ صرف انہی آیات کو لے لیا اور دوسری جگہ جو کچھ فرمایا گیا تھا اس کو چھوڑ دیا۔ مثلاً اسی آیت میں آگے یہ فرمایا ہے کہ:

وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ

وہ نہیں گمراہ کرتا مگر فاسقین کو

اس حصے میں ضلالت کا سبب ان کے بُرے عمل کو قرار دیا ہے لیکن اشاعرہ کی نظر اس پر نہیں گئی۔ انہوں نے آیت کے پہلے حصہ ہی پر اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھ لی۔

یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ خداوند تعالیٰ کی مشیئت عالمگیر اور ہر چیز پر حاوی ہے اس لیے جب وہ یہ کہتا ہے کہ میں جس کو چاہوں گمراہ کر دوں تو یہ بات ٹھیک ہے کہ یہ بیان کسی چیز سے مشروط نہیں ہے لیکن قرآن مجید نے جہاں اللہ تعالیٰ کی مشیئت کی عالمگیری کو بیان کیا ہے وہیں یہ بات بھی بیان کی ہے کہ مشیئت مطلق نہیں بلکہ مقید بالحکمت ہے یعنی خدا کی مشیئت حکمت اور عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ چنانچہ سورہ دہر

میں فرمایا:

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝	یہ تو ایک یاد دہانی ہے تو جو چاہے اپنے رب کی راہ اختیار کرے اور تم نہیں چاہ سکتے مگر یہ کہ اللہ چاہے بے شک اللہ علیم وحکیم ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے۔ رہے ظالم تو ان کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

(الدھر ۷۶ : ۲۹ - ۳۱)

ان آیات سے انسان کے ارادہ کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ یہ کہا ہے کہ انسان جو راستہ چاہے اختیار کرسکتا ہے وہ اپنی صوابدید سے نیکی کا راستہ اختیار کرسکتا ہے لیکن اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو استعمال کرے جو لوگ ان صلاحیتوں کو ضائع کر بیٹھتے ہیں وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے بنتے ہیں۔

اشاعرہ نے جب یہ کہا کہ انسان مجبور محض ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس پر جہنمی یا جنتی ہونے کا ٹھپہ لگا دیا ہے تو اس پر یہ اعتراض پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے یہ کہنے کے کیا معنی ہیں کہ تم ہدایت اور نیکی کا راستہ اختیار کرو۔ جب ایک آدمی اندھا ہے تو اس کو یہ کہنے کے کیا معنی کہ آنکھیں کھول کر دیکھو۔ وہ کس طرح دیکھے گا؟ یہ تو تکلیف مالایطاق ہوگی۔ اشاعرہ نے اس کا جواب یہ دیا کہ اللہ تعالیٰ تکلیف مالایطاق دے سکتا ہے۔ اس پر یہ اعتراض ہوا کہ قرآن میں تو یہ ہے کہ:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا

(البقرہ ۲ : ۲۸۶)

تو امام رازی جیسے شخص نے تفسیر کبیر میں یہ لکھ دیا کہ جو بات اتنی براہنیات سے ثابت ہے اس کے متعلق ایک آیت جس کے الفاظ کی دلالت اس کے معنی پر مشتبہ ہے، کیا کام دے سکتی ہے؟ براہنیات سے ان کا مطلب کلامی دلائل ہیں۔

اشاعرہ کے مذہب پر ایک اور اعتراض یہ کیا گیا کہ یہ کس طریقہ سے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ انصاف نہ کرے۔ اگر انسان پر ٹھپہ لگ چکا ہے تو پھر جنت و دوزخ بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ خیر و شر اور نیکی و بدی حکمی چیزیں ہیں، یہ عقلی چیزیں نہیں ہیں۔ یعنی خدا نے ایک چیز کو اچھا کہا ہے تو ہم اس کو اچھی سمجھتے ہیں اور اگر خدا نے کسی چیز کو برا کہا ہے تو ہم اس کو برا سمجھتے ہیں۔ لہٰذا جب خیر و شر عقلی چیز نہیں ہے تو خدا

نے جو کچھ کہا وہی خیر ہے۔ اشاعرہ کا یہ جواب اس لیے غلط ہے کہ قرآن خود بتاتا ہے کہ خدا نے ہماری جو فطرت بنائی ہے اس میں خیر و شر کا شعور ودیعت کیا ہے۔

اشاعرہ کو ایک اور غلط فہمی یہ ہوئی کہ انہوں نے مشیئت کا مفہوم چاہنے اور پسند کرنے کے معنی میں لے لیا اس لیے انہوں نے کہا کہ مومن کے ایمان اور کافر کے کفر دونوں کو خدا نے پسند کیا ہے۔ حالانکہ یہ بات بھی بالکل غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیئت کے تحت کسی شریر کو اس کی شرارت پر ڈھیل ملتی ہے یا کسی نیک بندے کو کسی اچھے کام کو پورا ہونے سے روک دیا جاتا ہے تو یہ اس بنا پر نہیں ہوتا کہ خدا کو شرارت پسند اور نیکی ناپسند ہوتی ہے بلکہ اس کی مشیئت ایک قاعدہ اور کلیہ کے مطابق اور عدل وحکمت اور رحمت پر مبنی ہوتی ہے۔

قرآن مجید کا نقطۂ نظر

اوپر کے مباحث سے یہ واضح ہوا کہ جبر و اختیار کا دائرہ ایک مخصوص دائرہ ہے جن کا تعلق ان امور سے ہے جن میں انسان کو مسئول قرار دیا گیا ہے، جن میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے کسی رویہ کو پسند یا ناپسند کیا ہے۔ طبعی اور تکوینی قوانین اور تقدیری امور سب اس دائرہ سے خارج ہیں لہٰذا اس مسئلہ پر بحث نہیں ہوسکتی کہ آپ کالے کیوں پیدا ہوئے گورے کیوں نہیں ہوئے، غریب کیوں ہوں امیر کیوں نہیں۔ البتہ یہ سوال ہوسکتا ہے کہ آپ نے نیک راہ کیوں نہیں اختیار کی اور بدی کی راہ پر کیوں چلتے رہے۔ جبر و اختیار کے مسئلہ میں فلسفیوں کی غلط فہمی کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ انہوں نے اس کا دائرہ زندگی کے تمام معاملات پر محیط کرلیا۔

دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ اگر کسی دائرہ میں انسان کو اختیار حاصل ہے تو کیا یہ مطلق اختیار ہے یا محدود اور مشروط ہے۔ اگر مطلق اختیار ہے اور کوئی پابندی نہیں تو اس سے ثنویت لازم آتی ہے۔ کیونکہ اس قسم کا اختیار تو صرف خالق کائنات کو حاصل ہے۔ ہر اختیار کے اوپر اس کا اختیار حاوی ہے لیکن یہ ماننے کے باوجود یہ کہنا صحیح نہیں کہ انسان کو کوئی اختیار نہیں ہے۔

جہاں تک نیکی اور بدی اور خیر و شر کا تعلق ہے تو ہمیں ان معاملات میں آزادی حاصل ہے لیکن یہ آزادی اور اختیار غیر محدود اور غیر مشروط نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت ومصلحت کا تقاضا ہو تو ہوسکتا ہے کہ وہ ہمارے کسی نیک سے نیک ارادہ کو پورا ہونے سے روک دے اور اگر اس کی حکمت کا تقاضا ہو تو وہ ہمارے برے سے برے فعل کو بھی ڈھیل دے دے۔ لیکن یہ بات یاد رکھیے کہ اگر اللہ تعالیٰ آپ کے کسی نیک سے نیک ارادہ کو پورا نہیں ہونے دے گا تو آپ کو اس کی جزا یا ثواب سے محروم نہیں کرے گا۔ اسی طرح اگر اس نے آپ کے کسی

بڑے ارادہ کو پورا ہونے سے روک دیا ہے تو آپ فعل بد کے وبال سے نہیں بچ سکیں گے۔ قرآن مجید کے اس ضابطہ کا اطلاق اسی صورت میں ہوتا ہے۔ جب آپ کسی فعل کو تعمد قلب کے ساتھ کرنا چاہتے ہوں۔ ویسے دل میں نہ جانے کتنے وسوسے اور خیالات آتے رہتے ہیں جن کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اصل چیز تعمد قلب یا عزم ارادہ ہے۔

جنگ تبوک کے معاملہ میں معذورین کا جو پوزیشن قرآن مجید میں بیان ہوا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آپ کو کیا اختیار حاصل ہے کیا نہیں حاصل ہے۔ جن لوگوں نے تبوک جانے کے لیے سواری حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن سواری نہیں مل سکی، سرمایہ جمع کرنے کی کوشش کی وہ بھی جمع نہ ہو سکا، وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آنحضرتؐ نے بھی ان کے لیے سواری اور سرمایہ فراہم کرنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ قرآن مجید نے ان لوگوں کے متعلق یہ کہا ہے کہ تبوک کے مجاہدین جن جن وادیوں سے گزرے ان میں یہ سب لوگ بھی شریک تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں ان کے مصمم ارادہ کا صلہ ملا۔ اس کے برعکس جو لوگ وسائل رکھنے کے باوجود جنگ میں شریک نہ ہوئے اور بہانے بنا کر مدینہ میں رہ گئے تو ان کے شوق جہاد کے دعووں کے باوجود قرآن مجید نے ان کی بات کو تسلیم نہیں کیا۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کے اختیار کی حدود کیا ہیں۔ آپ نیکی یا بدی کا انتخاب کر سکتے ہیں، اس کے لیے اسکیم اور پروگرام بنا سکتے ہیں، جدوجہد کر سکتے ہیں لیکن آپ کے ارادوں کو بروئے کار لانا اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق ہوگا۔ وہ چاہے گا تو آپ کا ارادہ پورا ہو جائے گا، اگر نہیں چاہے گا تو آپ کا ارادہ پورا نہیں ہوگا۔ لیکن آپ کو اس کی جزا و سزا ضرور ملے گی۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید نے حضرت یعقوبؑ کا واقعہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی کہ مصر میں مختلف راستوں سے داخل ہونا، ایک راستہ سے نہ جانا۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ تدبیر اس لیے کی کہ ایک ہی خاندان کے اچھی شکل و صورت اور عزت وجاہت رکھنے والے نوجوان اگر اکٹھے گزریں گے تو لوگوں کی توجہ ان کی طرف ہوگی اور برے لوگوں میں ان کو نقصان پہنچانے کا داعیہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر الگ الگ داخل ہوں گے تو اس طرح کے خطرات سے محفوظ رہیں گے۔ حضرت یعقوبؑ کی اس ہدایت کے متعلق قرآن مجید میں کہا ہے کہ یعقوبؑ کے دل میں جو تدبیر آئی وہ انہوں نے کر لی لیکن وہ اس طرح اپنے بیٹوں کو اس صورت حال سے نہ بچا سکے جس کا خدا نے فیصلہ کر رکھا تھا۔

ان شاء اللہ کی اہمیت :

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ مستقبل میں کسی کام کا ارادہ ظاہر کرتے وقت انشاء اللہ کہنے کی بڑی

اہمیت ہے جب آپ یہ کہتے ہیں کہ ان شاء اللہ میں یہ کام کروں گا تو اس پورے فلسفہ کو سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ میرا اختیار کتنا ہے۔ آپ واضح کرتے ہیں کہ میرا مصمم ارادہ ہے، میں کوشش کروں گا، تدبیر کروں گا لیکن منصوبہ کو بروئے کار لانا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور وہ اس کی حکمت و مصلحت کا پابند ہے۔ قرآن مجید میں نبی اکرمؐ کو بھی یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جب کوئی وعدہ کیا کرو تو ان شاء اللہ کے ساتھ وعدہ کیا کرو۔

لَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ
کسی امر کے لیے یوں نہ کہا کرو کہ میں کل کروں گا مگر یہ کہ اللہ چاہے۔
(کہف ۱۸ : ۲۳-۲۴)

تقدیر کا مفہوم :

خدا خالق کائنات ہے۔ وہ اپنی کائنات کی ایک ایک چیز سے واقف ہے۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے وہی ہوگا۔ جس کی جتنی عمر لکھی ہے وہ اس سے ایک سیکنڈ کم یا زیادہ نہیں پائے گا جس کا جتنا رزق لکھا ہے اس کو اتنا ہی رزق ملے گا۔ اسی طرح جس کا جنت میں جانا لکھا ہے وہ جنت میں جائے گا اور جس کا دوزخ میں جانا لکھا ہے وہ دوزخ میں جائے گا۔ کیونکہ یہ سب کچھ خدا کی صفات کا تقاضہ ہے۔ لیکن اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیے کہ خدا نے جو کچھ لکھا ہے اگر وہی کچھ ہوگا تو پھر ہمارا سب کچھ کرنا، محنت کرنا اور عبادت کرنا بے کار ہے۔ کیونکہ جہاں اس نے کسی کے لیے لکھا ہے کہ وہ دوزخ میں جائے گا وہیں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اپنے فلاں فلاں عمل کی وجہ سے دوزخ میں جائے گا، اسی طرح جس کے متعلق یہ لکھا ہے کہ وہ جنت میں جائے گا وہیں اس کے لیے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ اپنے نیک اعمال کی بدولت جنت میں جائے گا۔ یعنی جنت اور دوزخ میں جانے کے متعلق جو چیز موثر ہے وہ خدا کا علم نہیں بلکہ انسان کا اپنا عمل ہے۔ اس لیے انسان عمل سے مستغنی ہو کر بیٹھ رہنے کا فیصلہ نہیں کر سکتا کہ میرا مقدر تو خدا کے ہاں طے ہو ہی چکا ہے۔

ہدایت و ضلالت کے متعلق خدا کی سنت :

ہدایت و ضلالت کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے جو ضابطہ مقرر کیا ہے وہ تمام تر عدل و حکمت پر مبنی ہے۔ یہ ضابطہ قرآن مجید میں مفصل بیان ہوا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو فطرت اللہ پر پیدا کرتا ہے۔ فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْہَا ۔ اس کے بعد اس نے سنت اللہ یہ مقرر کی ہے کہ جو لوگ اس فطری نیکی کی قدر کرتے ہیں، اس کا شکر ادا کرتے ہیں، اس کو پروان چڑھاتے ہیں۔ اس کو

اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھتے ہیں تو ان کے لیے اللہ تعالیٰ نبیوں، رسولوں، معلّمین اور مصلحین کے ذریعے سے نیکی کے مزید دروازے کھول دیتا ہے اور جو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے تو جو کچھ ان کو دیا گیا ہے وہ بھی ان سے چھین لیا جاتا ہے۔ یہ بالکل فطری بات ہے جو نیکی اللہ تعالیٰ نے آپ کو ودیعت کی ہے اگر آپ نے اس کی قدر نہ کی تو آپ کیسے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ نیکیوں کا سارا خزانہ آپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔

اس ضابطہ پر غور کریجیے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت عدل و حکمت پر مبنی ہے کہ نہیں! جب یہ عدل و حکمت پر مبنی ہے تو اس کے بعد کوئی جھگڑا نہیں رہ جاتا۔ اس لیے کہ قرآن مجید میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے تو یہ معاملہ الل ٹپ نہیں ہوتا بلکہ اسی ضابطہ کے مطابق ہوتا ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ خدا کی مشیئت ایک ضابطہ اور سنت کی پابند ہے۔ اس پر یہ اعتراض بے معنی ہوگا کہ خدا کی مشیئت پابند کیسے ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہ پابندی ہم خدا پر نہیں لگا رہے ہیں بلکہ یہ ضابطہ خدا نے خود اپنے لیے بنایا ہے اور وہ اس ضابطہ کی پابندی کرتا ہے تو اس سے اس کے ضابطہ اور اس کی شان میں کوئی گستاخی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ہر کام اپنی شان اور اپنی صفات کے تقاضوں اور حکمتوں کے مطابق کام کرتا ہے۔ اس لیے قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی خدا کی مشیت یا فعل ہدایت و ضلالت کا علی الاطلاق بیان ہوتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کی مشیئت کسی حکمت کی پابند نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کی مشیئت اس ضابطہ کے مطابق ظاہر ہوتی ہے جو ضابطہ اس نے بنایا ہے یعنی ان لوگوں کو ہدایت دیتا ہے جو اس کے مستحق ہوتے ہیں اور ان لوگوں کو گمراہ کرتا ہے جو لوگ گمراہی کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

ہدایت دینے یا گمراہ کرنے کی جو اصطلاح قرآن مجید میں آئی ہے اس کا بھی ایک خاص مفہوم ہے ہدایت دینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہدایت کی توفیق بخشتا ہے اور گمراہ کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ گمراہی پر جانے کے لیے آدمی کو ڈھیل دے دیتا ہے۔ اس وجہ سے جن لوگوں نے یہ کہا کہ خدا انسان کو خلاف عقل باتوں کا حکم دے سکتا ہے یا ایسی باتوں کا حکم دے سکتا ہے جس کی وہ طاقت نہیں رکھتے تو یہ علم کی کمی ہے۔

ختم قلوب کا قانون:

اس سلسلہ میں ایک اور مسئلہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ قرآن مجید میں بعض گروہوں کے متعلق بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے، اب اس میں ہدایت داخل نہیں ہو سکتی یا ان کے

دلوں پر سیاہی چھا گئی ہے، اب اس سیاہی سے ان کا دل کسی طرح صاف نہیں ہو سکتا۔ ان کے لیے ہدایت کی راہ مسدود ہو چکی ہے۔ قرآن مجید نے جہاں ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بات بھی صاف کر دی ہے کہ ہر انسان کی فطرت میں اس نے نیکی اور بدی کا شعور ودیعت کر دیا ہے۔

قرآن مجید میں صاف الفاظ میں آیا ہے:

وَنَفْسٍ وَمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا	شاہد ہے نفس اور جیسا کچھ اس کو سنوارا پس اس
فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا	کو سمجھ دی اس کی نیکی اور بدی کی۔

(شمس ۹۱ : ۷-۸)

معلوم ہوا کہ ازل سے تمام انسانوں کو فطرت ابراہیمی ملی ہوئی ہے اور نیکی اور بدی کا یہی وہ دائرہ ہے جس میں وہ مسئول قرار دیے گئے ہیں لہٰذا اس قانون کی زد میں وہ لوگ آتے ہیں جو اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے، جن کو خدا نے دل تو دیا ہے لیکن وہ اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے، آنکھیں تو دی ہیں لیکن ان سے وہ دیکھنے کا کام نہیں لیتے، دماغ تو دیا ہے لیکن وہ اس سے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ یہاں سوچنے، سمجھنے، دیکھنے اور سننے کا خاص مفہوم ہے۔ موجودہ زمانے کا انسان جو سائنس کے اسلوب میں ہے اس نے اپنی سماعت، بصارت اور ذہانت بہت بڑھا لی ہے۔ سماعت کا حال تو یہ ہے کہ انسان دنیا کے ایک کونے میں بیٹھے بٹھائے دوسرے کونے میں بات کر سکتا ہے۔ بصارت کا بھی یہ حال ہے کہ انتہائی طاقتور دوربینیں ایجاد کر لی ہیں جن کے ذریعہ دور دراز ستاروں اور سیاروں کو دیکھ سکتا ہے جس کا پہلے کوئی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن جو انسان اس پہلو سے اتنا ذہین ہے وہ عقلی اور روحانی پہلو سے انتہائی غبی ہے اس کو تل تو نظر آ جاتا ہے لیکن اس کی اوٹ کا پہاڑ نظر نہیں آتا۔ اس لیے اگر انسان سب کچھ سنے لیکن وہی بات نہ سنے جو سننے کی ہے، ہر چیز پر غور کرے لیکن اس سوال پر غور نہ کرے جو غور کرنے کا ہے، ہر چیز کو دیکھے لیکن وہی چیز اس کو نظر نہ آئے جو دیکھنے کی ہے تو اس کو آپ کیا کہیں گے۔ قرآن مجید نے کہا ہے کہ اگر یہ تمہارے آنکھ، کان اور یہ منہ سب تمہیں ٹھوکر کھلانے والے ہیں تو بہتر یہ ہے کہ ان کو بھر کر سپاٹ کر دیا جائے۔ پس خداوند تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ جو لوگ اس کی دی ہوئی ہدایت کے شکرگزار ہوتے ہیں اور جو اس کی دی ہوئی طاقتوں اور قوتوں سے صحیح فائدہ اٹھاتے ہیں تو ان کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور ان کو مزید ہدایت کی توفیق ملتی ہے لیکن جو لوگ ان چیزوں کو ضائع کر دیتے ہیں تو خداوند تعالیٰ ان کی صلاحیتوں کو سلب کر لیتا اور ہدایت کا دروازہ ان پر بند کر دیتا ہے۔

(ترتیب: محبوب سبحانی)

تاریخ و سیر

امین احسن اصلاحی

اسلامی معاشرہ کا سب سے بڑا آدمی (۲)

حضرت ابوبکرؓ کی داخلی اور خارجی پالیسی :

پالیسی کا لفظ سنتے ہی جھوٹ ، فریب ، دغابازی اور مکاری ایسے گھنونے تصورات دماغ کے سامنے آکھڑے ہوتے ہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے صالح حکمران کی طرف اس لفظ کا انتساب بھی سوءِ ادب معلوم ہوتا ہے لیکن جو بات کہنی ہے وہ ٹھیک ٹھیک چونکہ اسی لفظ سے ادا ہوسکتی ہے اس لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ سوءِ ادب کے پہلو کو نظر انداز کرکے اس لفظ کو استعمال کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ یہ ایمانی دغابازی جس چیز کے لازمی تعفنات میں سمجھی جاتی ہیں وہی چیز جب ایک مثالی اسلامی نظام میں ایک خلیفۂ راشد کے ہاتھوں برتی جاتی ہے تو کتنی پاکیزہ اور کتنی ستھری چیز بن جاتی ہے اور جھوٹ اور فریب کی آلائش اس کے مزاج سے کتنی بے جوڑ ہو جاتی ہے ۔

حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد حکومت کے داخلی اور خارجی امور کی انجام دہی میں جن باتوں کو اپنی پالیسی کے اصول کے طور پر پیش نظر رکھا، ان کا اظہار انہوں نے اپنی پہلی ہی تقریر میں نہایت واضح الفاظ میں کر دیا تھا۔ یہ تقریر اگرچہ نہایت اختصار کے ساتھ نقل ہوئی ہے لیکن ایک غور کرنے والے شخص کے لیے ان کی پالیسی کے ہر پہلو کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہے ۔ چنانچہ ہم ذیل میں ان کی اسی تقریر کی مدد سے ان کی پالیسی کے بنیادی اصول کو ایک مناسب ترتیب کے ساتھ پیش کرتے ہیں تاکہ لوگ اندازہ کر سکیں کہ ایک اسلامی حکمران اور ایک اسلامی حکومت کا مزاج ایک غیر اسلامی حکمران اور ایک غیر اسلامی حکومت کے مزاج سے کتنا مختلف ہوتا ہے ۔

۱۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سیاست کا پہلا اصول یہ تھا کہ وہ جس کے خلیفہ ہیں اس کے منشاء کو سیاسی

زندگی کے ہر گوشہ میں پورا کریں اور اس راہ میں کسی خطرہ کی بھی پروا نہ کریں۔ وہ جس طریقہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں آپ کے ہر حکم کی بے چون و چرا تعمیل کرتے تھے اسی طریقہ سے خلیفہ ہونے کے بعد بھی انہوں نے اپنا اور اپنی حکومت کا اصل مقصد یہ قرار دیا کہ تمام معاملاتِ سیاست و تمدن کی انجام دہی میں ٹھیک ٹھیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم کی پیروی کی جائے اور آپ کے جو منصوبے آپ کی زندگی میں ناتمام رہ گئے ہیں وہ پورے کیے جائیں اگرچہ اس راہ میں کتنی ہی مشکلیں پیش آئیں۔ چنانچہ خلیفہ ہونے کے بعد انہوں نے جو پہلی تقریر کی اس میں یہ بات واضح کر دی کہ میری حکومت کا مقصد صرف اللہ اور رسول کے منشاء کو ٹھیک ٹھیک پورا کرنا ہے ۔اگر میں اس مقصد سے ہٹ جاؤں تو لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مجھے ہٹا دیں اور کسی دوسرے کو اپنا سربراہ کار بنا لیں۔ بعینہٖ اسی حقیقت کا اظہار انہوں نے اپنی دوسری تقریر میں فرمایا جو حضرت اسامہؓ کے لشکر کو بھیجتے وقت کی۔ اس میں انہوں نے فرمایا: "اے لوگو! میں تمہارے ہی جیسا ایک عام انسان ہوں۔ مجھے نہیں معلوم، شاید آپ مجھ سے وہ توقعات کر بیٹھیں جو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی پوری کر سکتے تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام دنیا کے لیے ہادی بنایا تھا اور آپ کو ہر قسم کی غلطیوں سے محفوظ کر دیا تھا، یہ چیز مجھے حاصل نہیں ہے تاہم میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں حضورؐ ہی کے نقشِ قدم پر چلوں گا۔ اور آپ کے بتلائے ہوئے راستے سے ہٹ کر کوئی نئی راہ نہیں نکالوں گا۔ اگر میں سیدھی راہ پر چلوں تو میری پیروی کیجیے اگر میں اس سیدھی راہ سے ذرا بھی ہٹ جاؤں تو مجھے سیدھا کر دیجیے"۔

الفاظ میں جو بات انہوں نے فرمائی عملی سیاست سے پوری مضبوطی کے ساتھ اس کو کر بھی دکھایا۔ چنانچہ خلیفہ ہونے کے بعد سب سے پہلا حکم انہوں نے جو دیا وہ حضرت اسامہؓ کے لشکر کی روانگی کا حکم تھا، جس کی روانگی کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم دے چکے تھے لیکن آپ کی وفات کے سبب سے جس کی روانگی ملتوی ہو گئی تھی۔ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس روانگی کے سخت خلاف تھی۔ کچھ لوگ اس کی روانگی سے اس لیے اختلاف کر رہے تھے کہ ملک میں بغاوت پھوٹ پڑی تھی، ایسی حالت میں تمام بڑے بڑے صحابہ کا ملک سے باہر کسی مہم پر چلے جانا ان لوگوں کے نزدیک خلافِ مصلحت تھا۔ دوسرے کچھ لوگوں کو حضرت اسامہؓ کی قیادت پر اعتراض تھا۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ بڑے بڑے صحابہ کی موجودگی میں اسامہؓ جیسے کم عمر آدمی کو فوج کا سپہ سالار بنانا ٹھیک نہیں ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان دونوں گروہوں میں سے کسی گروہ کی بھی بات نہیں مانی اور جواب میں ان دونوں سے جو بات کہی وہ یہ تھی کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام منصوبوں کو بترتیب پر پورا کرنا اپنی حکومت کا مقصدِ وجود سمجھتے ہیں۔ پہلے گروہ کو انہوں نے جو جواب دیا وہ خود ان

کے الفاظ میں کتابوں میں یوں نقل ہوا ہے :

"اس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں ابوبکر کی جان ہے! اگر مجھے یہ اندیشہ بھی ہو کہ مجھے کتے اور بھیڑیے اچک لے جائیں گے جب بھی میں اسامہؓ کے لشکر کو بھیج کر دم لوں گا۔ میں کسی ایسے فیصلے کو رد نہیں کر سکتا جو رسول اللہ نے کیا ہے۔"

اور دوسرے گروہ کے نمائندہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کی داڑھی پکڑ کر نہایت جوش کے ساتھ انہوں نے جو جواب دیا وہ یہ تھا :

"تمہاری ماں تم کو روئے اے ابن خطاب! اسامہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سپہ سالار بنایا اور تم مجھ سے یہ مطالبہ کر رہے ہو کہ میں ان کو معزول کر دوں۔"

ان کی اس پالیسی کی شہادت ان کے اس جواب سے بھی ملتی ہے جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دیا جب کہ انہوں نے فدک وغیرہ کی زمینوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت کا مطالبہ کیا۔ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ موقع بہت نازک تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری بیٹی کی خاطر داری حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ کسی دوسرے شخص کو عزیز نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن چونکہ ان کے نزدیک اس معاملہ میں حضرت فاطمہؓ کو خوش رکھنا خود رسول کریم کی ناخوشی کے مترادف تھا، اس وجہ سے انہوں نے سیدہ فاطمہ کے مطالبہ کو تسلیم نہیں کیا اور ان کو صاف جواب دے دیا کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کام جس طرح کرتے دیکھا ہے اسی طرح کروں گا۔" جس کا مطلب یہ تھا کہ فدک وغیرہ کی زمینوں کا انتظام جس شکل میں رسول اللہ کے زمانہ میں تھا، اسی طرح ان کے زمانہ میں بھی برقرار رہے گا اور رسول اللہ کے اختیار کیے ہوئے طریقہ کے خلاف وہ اس میں کسی طرح کا تصرف نہیں کریں گے، اگرچہ ان کو اس کے لیے جگر گوشہ رسول کی ناخوشی ہی کیوں نہ مول لینی پڑے۔

۲۔ حضرت ابوبکرؓ کی سیاست کا دوسرا اصول یہ تھا کہ تمام معاملاتِ حکومت کو سچائی، امانت اور دیانت کے ساتھ انجام دیا جائے۔ جھوٹ، فریب، دورُخے پن اور پراپیگنڈہ بازی کے شیطانی ہتھیاروں سے محض اپنا اقتدار جمائے رکھنے کی کوشش نہ کی جائے۔ وہ اقتدارِ حکومت کو خدا کی امانت تصور کرتے تھے اور اس امانت کا یہ حق سمجھتے تھے کہ اس کو پوری ایمانداری کے ساتھ ادا کیا جائے۔ اگر اپنا اقتدار جمائے رکھنے کی خاطر لوگوں کی آنکھوں میں جھوٹے پراپیگنڈے کے زور سے خاک جھونکنے کی کوشش کی گئی تو ممکن ہے اس سے کچھ دنوں کے لیے لوگوں کو دھوکے میں رکھا جا سکے، لیکن یہ درحقیقت اس امانت میں خیانت ہے جو اللہ کی طرف سے ہمارے سپرد کی گئی ہے۔ اپنی اس پالیسی کا اعلان انہوں نے اپنی پہلی تقریر کے دوسرے فقرے میں ان شاندار الفاظ میں فرمایا:

الصدق امانة والكذب خيانة۔

معاملات کو سچائی کے ساتھ انجام دینا امانت داری ہے اور جھوٹ اور فریب کے ساتھ انجام دینا خیانت ہے۔

ان الفاظ میں حضرت ابوبکرؓ نے اپنا اور اپنی حکومت کا جو سیاسی مسلک بتایا تھا اس کو انہوں نے اپنے دو سوا دو سال کے زمانۂ حکومت میں جس خوبی کے ساتھ نبھایا ہے کوئی شخص بھی اس کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے خود بھی تمام داخلی اور خارجی معاملات میں اسی اصول کو پیش نظر رکھا اور ان کے عُمّال نے بھی اسی اصول پر عمل کیا۔ ان کی پوری سیاسی زندگی میں ایک مثال بھی اس بات کی پیش نہیں کی جا سکتی کہ انہوں نے کبھی جھوٹ کو اپنے کسی سیاسی مقصد کے حصول کا ذریعہ بنایا ہو۔ اور پھر وہ چیز بھی کیا تھی جس کے لیے حضرت ابوبکرؓ جھوٹ اور فریب کا سہارا لیتے۔ جس منصبِ خلافت پر وہ فائز تھے اس کو وہ کوئی طمع کی چیز نہیں سمجھتے تھے کہ اس کے لیے جھوٹ اور فریب کے ہتھکنڈے استعمال کریں۔ وہ اس کو کانٹوں کا تاج سمجھتے تھے اور اپنی خواہش کے بالکل خلاف، محض لوگوں کے اصرار کی وجہ سے، اس کو اپنے سر پر رکھ لیا تھا۔ اس سے اپنی بیزاری کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا: "دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ بدبخت طبقہ حکمرانوں کا طبقہ ہے۔"

اس منصب کو انہوں نے دنیا کے عیش اور دنیا کی عزت و شوکت کا ذریعہ نہیں بنایا تھا کہ ان چیزوں کے طمع میں اس منصب سے چمٹے رہنے کی کوشش کریں۔ خلیفہ ہونے سے پہلے ان کی زندگی کا جو معیار تھا خلیفہ ہونے کے بعد بھی اس میں سرِ مُو فرق نہیں آیا۔ اور اگر فرق آیا تو اس فرق کی نوعیت یہ تھی کہ ان کا سابق معیارِ زندگی کچھ گر ہی گیا، یہ نہیں ہوا کہ وہ کچھ اونچا ہو گیا ہو۔ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے سے پہلے وہ بالعموم شب میں مدینہ سے کچھ فاصلہ پر سُنح میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ وہاں ان کا ایک چھوٹا سا دیہاتی مکان تھا۔ خلیفہ ہونے کے بعد تقریباً چھ مہینے تک یہی مکان ان کی قیام گاہ رہا۔ اس میں انہوں نے سرِ مُو کسی تغیر و ترمیم کی ضرورت نہیں محسوس کی اور مدینہ سے سُنح تک ان کی روزانہ کی آمد و رفت بالعموم پیدل ہوا کرتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد خلافت کی ذمہ داریوں کے تقاضے سے مجبور ہو کر جب مدینہ میں قیام شروع کیا تو یہاں بھی اپنے ہی ایک چھوٹے سے مکان میں قیام کیا اور اس مکان میں بھی کسی قسم کی ترمیم و اصلاح کی ضرورت نہیں محسوس کی، حالانکہ اب وہ ایک ایسے حکمران تھے جس کی فوجیں عرب سے نکل کر عراق اور شام کی تسخیر کے منصوبے باندھ رہی تھیں۔

ان کی معاش کا حال یہ تھا کہ خلیفہ ہونے کے بعد کچھ دنوں تک بدستور کپڑے کی تجارت کرتے رہے اور یہ خیال تھا کہ اسی طرح وہ اپنی اور اپنے متعلقین کی معاش خود اپنی محنت سے پیدا کر کے مسلمانوں کی خدمت حسبۃً للہ انجام دیتے رہیں گے لیکن جب خلافت کی ذمہ داریوں نے ان کا سارا وقت سونت لیا اور ان کے لیے اپنے تجارتی کاموں کے لیے وقت بچانا ناممکن ہو گیا تب انہوں نے مجبوراً اپنا اور اپنے متعلقین کا گزارہ

بیت المال سے لینا منظور کیا۔ لیکن اس چیز پر ان کی طبیعت مطمئن نہیں ہوئی۔ چنانچہ وفات کے وقت انہوں نے اپنے وارثوں کو یہ وصیت کی کہ بیت المال سے انہوں نے اپنے اور اپنے بچوں کے گزارے کے لیے جو رقم لی ہے اس کے بدلے میں ان کی فلاں زمین بیت المال کے حوالہ کر دی جائے۔ ان کے اس ایثار کی اطلاع جب حضرت عمرؓ کو ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ "ابوبکرؓ نے اپنے بعد آنے والوں کو تھکا دیا" یعنی انہوں نے دین و ملت کی خدمت کی جو مثال قائم کی ہے اس کی پیروی کرنا دوسروں کے بس کی بات نہیں۔"

غور کا مقام ہے کہ جو شخص اس احساس ذمہ داری کے ساتھ حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالے گا اور اس بے لوثی و بے نفسی کے ساتھ ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی کوشش کرے گا، اس کو کیا پڑی ہوئی ہے کہ وہ اپنی اس عبادت کو جھوٹ اور فریب سے آلودہ کرے اور وہ بھی اس ذلیل غرض کے لیے کہ اس منصب کا بلا شرکتِ غیرے وہی مالک بنا رہے، کسی دوسرے کی طرف لوگوں کی نگاہ نہ اٹھے۔

۳۔ تیسری چیز جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی حکومت میں پیشِ نظر رکھی وہ ایک ایسے نظامِ عدل و انصاف کا قیام تھا جو ہر قسم کے ناجائز اثرات کے دباؤ سے بالکل پاک اور آزاد ہو۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بے اثر ہو وہ بغیر کسی مزاحمت کے ان کی حکومت کے اندر اپنے حقوق کی حفاظت بھی کر سکے اور اپنے حقوق بھی حاصل کر سکے اور اس چیز کے لیے حقدار ہونے کے سوا اسے کسی اور سند کی ضرورت نہ پیش آئے۔ اسی طرح ایک شخص خواہ کتنا ہی با اثر اور زور آور ہو، لیکن نہ وہ کسی شخص کے حق پر دست درازی کر سکے اور نہ حکومت سے اپنے واجبی حق سے ایک رتی برابر زیادہ حاصل کر سکے اور اگر وہ اس طرح کی جسارت کبھی کر بیٹھے تو اپنے تمام زور و اثر کے باوجود فوراً اپنے اس ظلم کی سزا بھگتے۔ اس پہلو سے غلام اور آقا، حاکم اور محکوم، امیر اور غریب میں حضرت ابوبکرؓ کسی قسم کا فرق کرنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ ایک طرف لوگوں کو ان کی فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے اس بات کا پورا موقع دینا چاہتے تھے کہ کوئی شخص اپنی ذہانت، اپنے زور اور اپنے مال کو دوسروں کو دبانے اور ان کے حقوق کے تلف کرنے کے لیے نہ استعمال کر سکے۔ دوسری طرف وہ اگرچہ مصنوعی طور پر سارے ملک کے اندر صرف ایک ہی طبقہ قائم کرنے کے درپے نہیں تھے، لیکن وہ کسی ایک ہی طبقہ یا بعض طبقات کی حوصلہ افزائی کرنے اور ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ پر ظلم و تعدی کرنے کے مواقع دینے کو بھی تیار نہیں تھے۔ حصولِ معاش کی جدوجہد میں جو فرقِ مراتب فطری طور پر پایا جاتا ہے اس کے مٹانے کے لیے انہوں نے کوئی سکیم نہیں بنائی کیونکہ ایسا کرنا وہ عقل اور فطرت کے خلاف سمجھتے تھے، لیکن بیت المال سے جو وظائف انہوں نے مسلمانوں کے لیے جاری کیے اس میں ہر درجہ کے مسلمانوں کو بالکل مساوی رکھا اور جب ان سے یہ کہا گیا کہ لوگوں کی دینی خدمات کی بنا پر ان کے وظائف میں فرق ہونا چاہیے تو انہوں نے اس کا جواب یہ دیا کہ "دینی خدمات کا صلہ اللہ تعالیٰ

دے گا، اس کی بنا پر لوگوں کے معاش کے معاملہ میں ہم فرقِ مراتب کیوں روا رکھیں؟"

اپنے اس نصب العین کا اظہار بھی حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے ہی خطبہ میں کر دیا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ "آپ کے اندر جو شخص بے اثر ہے وہ میرے نزدیک با اثر ہے، جب تک کہ اس کا حق اس کو نہ لوٹا دوں اور آپ کے نزدیک جو شخص با اثر ہے وہ میرے نزدیک بے اثر ہے جب تک کہ میں اس سے حق وصول نہ کر لوں۔" اور ان کا سوا دو سال کا زمانۂ حکومت اس بات کی شہادت ہے کہ انہوں نے اپنی حکومت میں حق کے سوا کسی اور چیز کو با اثر ہونے کا موقع نہیں دیا۔

۴۔ چوتھی چیز جو حضرت ابوبکرؓ نے شروع ہی سے اپنی حکومت میں پیشِ نظر رکھی وہ بدکاری کا قلع قمع کرنا تھا۔ وہ قرآن مجید کی بدولت اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ جس قوم میں بدکاری عام ہو جاتی ہے اس پر خدا کی طرف سے ہمہ گیر تباہی آتی ہے جو اس قوم کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اس رمز سے اچھی طرح باخبر ہونے کی وجہ سے انہوں نے شروع ہی سے اس امر کا اہتمام رکھا کہ یہ وبا ان کی قوم میں پھیلنے نہ پائے اور اس کے خلاف انہوں نے اپنے خطبہ میں اپنی قوم کو یاد دہانی کر دی۔ ان کے الفاظ یہ تھے:

"یاد رکھو کہ جب قوم میں بدکاری عام ہو جاتی ہے تو اس پر تباہی بھی عام ہو جاتی ہے۔"

حضرت ابوبکرؓ کے یہ الفاظ اس امر کو واضح کر رہے ہیں کہ وہ بدکاری کی روک تھام کو صرف افراد کے انفرادی تزکیہ کے ہی نقطۂ نظر سے ضروری نہیں سمجھتے تھے، بلکہ قومی اور ملکی تحفظ کے نقطۂ نظر سے اس کی روک تھام کو ناگزیر خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اس چیز کے سبب سے ریاست کی سلامتی خطرے میں پڑ سکتی تھی اور پوری قوم کسی بڑی تباہی میں مبتلا ہو سکتی تھی۔ اس وجہ سے وہ اس کام کو محض اصلاحی اداروں پر نہیں چھوڑ سکتے تھے، بلکہ اس کی روک تھام کے لیے تمام ضروری تدبیریں اختیار کرنا اپنا اور اپنی حکومت کا فرض سمجھتے تھے اور اس فرض کو اتنی ہی اہمیت دیتے تھے جتنی اہمیت قومی تحفظ کی دوسری تدبیروں کو دیتے تھے۔

۵۔ پانچویں چیز جس کو حضرت ابوبکرؓ نے اپنی سیاست کے ایک اہم اصول کی حیثیت سے پیشِ نظر رکھا وہ جہاد ہے۔ جہاد کے معنی ان اصولوں کو غالب کرنے کی کوشش کرنا ہے جن پر اسلامی قومیت یا اسلامی ریاست کی تعمیر ہوئی تھی۔ وہ ایک اصولی قومیت کے علمبردار اور ایک اصولی ریاست کے حکمران ہونے کی وجہ سے اجتماعیات کے اس رمز سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ کسی ایک مقام پر ٹھہرے رہ کر اپنی زندگی برقرار نہیں رکھ سکتے۔ ان کے لیے ٹھہرنا پیچھے ہٹنے یا موت کے ہم معنی ہے۔ ان کے قومی اور سیاسی بقا کے لیے ضروری ہے کہ وہ جن اصولوں پر ایمان لائے ہیں اور جن اصولوں پر انہوں نے اپنی اجتماعی و سیاسی زندگی کی تشکیل کی ہے ان کو غالب کرنے کے لیے برابر کوشش کرتے رہیں یہاں تک کہ زمین کے ایک ایک چپہ پر ان کو غالب اور

حکمران بنا دیں۔ اس حقیقت کی طرف بھی انہوں نے اپنے پہلے ہی خطبہ میں ان الفاظ میں اشارہ کیا تھا: "لایدع قوم الجهاد فی سبیل الله الاضربهم الله بالذل" (جو قوم اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ترک کر دیتی ہے اللہ تعالیٰ اس پر ذلت مسلط کر دیتا ہے)۔

اس جہاد کے لیے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ ہوتے ہی دو بالکل تیار محاذ ملے۔ ایک ملک سے باہر رومیوں اور ایرانیوں کے مقابلہ میں اور دوسرا ملک کے اندر باغیوں اور مرتدوں کے مقابلہ میں۔ اور انہیں ان دونوں محاذوں پر بالکل ایک ہی وقت میں جنگ شروع کرنی پڑی۔ اب آئیے دیکھیے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان جنگوں میں کیا پالیسی رکھی اور اس پالیسی میں ان کو کس حد تک کامیابی ہوئی۔

جہاں تک عرب قوم کا تعلق تھا حضرت ابوبکرؓ کی پالیسی ان کے متعلق یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جس دین اور جس سیاسی مرکز پر جمع کر گئے ہیں وہ پوری مضبوطی کے ساتھ ان کو اس پر قائم رکھیں۔ آپ کے وفات پانے کے بعد جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں بہت سے قبائل میں، جو ابھی پوری طرح اسلام سے متاثر نہیں ہوئے تھے، ارتداد کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی طرح بہت سے قبائل نے مرکزی بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ تھے کہ اسلام کو اپنے دین کی حیثیت سے تو وہ مانتے ہیں لیکن مدینہ کی حکومت کے سیاسی اقتدار کو وہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے پورے عزم کے ساتھ اس فتنہ کا مقابلہ کیا اور تلوار سے کام لے کر ان دونوں رجحانات کا خاتمہ کر دیا۔ نہ تو کسی عرب کو اسلام سے انحراف کی اجازت دی اور نہ ان میں سے کسی گروہ کو مدینہ کی مرکزی حکومت کے حلقۂ اطاعت سے باہر نکلنے دیا۔

اس سلسلہ میں انہوں نے تمام قبائل عرب کے نام جو اعلان کیا تھا وہ خود ان کی پالیسی کا بہترین نقیب ہے۔ اس لیے ہم اس کا ضروری حصہ یہاں نقل کرتے ہیں:

"تم میں سے جو اسلام کا اقرار کرنے کے بعد، خدا سے بے پروائی، اس کے حکم سے ناواقفیت اور شیطان کی پیروی کے جوش میں، اسلام سے پھر گئے ہیں ان کے پھر جانے کی اطلاع مجھے ملی ..... میں نے فلاں شخص کو مہاجرین و انصار اور تابعین کی ایک فوج کے ساتھ تمہاری طرف بھیجا ہے اور اس کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ کسی جماعت سے اس وقت تک نہ جنگ کرے اور نہ اس کو قتل کرے جب تک اس کو خدا کی دعوت کی طرف پکار نہ لے۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں، اس کا اقرار کر لیں، اپنی مخالف اسلام حرکتوں سے باز آجائیں، نیک کام کرنے لگ جائیں، ان سے درگذر کرے اور ان کی مدد کرے اور جو لوگ اپنی ضد

پر قائم رہیں ان سے جنگ کرے اور جن پر قابو پالے ان پر ذرا رحم نہ کرے، ان کو آگ سے جلا دے[1] ان کو ہر طرح سے قتل کرے، ان کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کرلے اور اسلام سے کم ان سے کوئی چیز قبول نہ کرے۔ جو شخص اسلام کو قبول کرے گا وہ اس کے لیے بہتر ہے اور جو شخص اس سے اعراض کرے گا تو وہ خدا کے قابو سے باہر نہیں جا سکتا۔ میں نے اپنے منادی کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ تمہاری ہر جماعت میں میرا یہ اعلان سنا دے:"

اس اعلان میں حضرت ابوبکرؓ نے اہل عرب کی سیاسی و مذہبی وحدت کے جس عزم بالجزم کا اظہار کیا تھا اس کو عملاً بروئے کار لانے کے لیے الگ الگ گیارہ لشکر ترتیب دیئے اور ان کو اس ہدایت نامہ کے ساتھ عرب کے مختلف گوشوں میں بھیج دیا کہ

من لم يجب داعى الله فليقتل وليقاتل حيث كان ولا يقبل منه الا الاسلام۔	جو اللہ کے داعی کی دعوت پر لبیک نہ کہیں ان کو قتل کیا جائے اور ان سے جنگ کی جائے جہاں کہیں بھی وہ ہوں اور اسلام سے کم ان سے کوئی چیز قبول نہ کی جائے۔

عربوں کو ایک دین اور ایک سیاسی نظم کے تحت رکھنے کی یہ پالیسی حضرت ابوبکرؓ نے اخذ تو کی تھی قرآن کے احکام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیتوں سے لیکن نہایت شدید مخالف حالات کے اندر جبکہ اپنے بھی اس پالیسی سے اختلاف کر رہے تھے اور دوسرے بھی اس پالیسی کے خلاف ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، اس پالیسی کو عملی شکل دینے کا کام تنہا حضرت ابوبکرؓ صدیق نے انجام دیا اور اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اس کارنامہ نے امت کو ایک بڑی خوفناک تباہی سے بچا لیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ان کے اس کارنامہ پر مندرجہ ذیل الفاظ میں داد دی جس سے اس کارنامہ کی پوری اہمیت واضح ہوتی ہے۔ انہوں نے فرمایا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہم ایسی آزمائش میں پڑ گئے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ابوبکرؓ کے ذریعہ ہم پر احسان نہ فرمایا ہوتا تو ہم اس آزمائش میں فنا ہو جاتے۔ ہمارا فیصلہ تو یہ تھا کہ ہم اونٹنی اور اونٹ کی خاطر خواہ مخواہ کو لڑائی مول نہ لیں اور دوسروں سے بے تعلق ہو کر خود اللہ کی بندگی کرتے رہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ابوبکرؓ کے دل کو ان سے (مانعین زکوٰۃ سے) جنگ کرنے پر جما دیا اور وہ ان کی تذلیل اور ان

---

[1] بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ فتنۂ ارتداد کے زور کے زمانہ میں حضرت ابوبکرؓ نے بعض لوگوں کو جلا دیے جانے کی سزا دی لیکن بعد میں وہ اس فعل پر نادم ہوئے۔

کے ساتھ فیصلہ کن جنگ کے سوا کسی اور چیز پر راضی نہ ہوئے۔"

عرب کے اندر اپنی اس پالیسی کو پوری طرح کامیاب بنانے میں حضرت ابوبکرؓ کے دورِ حکومت کا تقریباً ایک پورا سال صرف ہو گیا۔ اس وجہ سے اُسامہؓ کے لشکر کے بھیجنے کے سوا عرب کے باہر اللہ کا کلمہ بلند کرنے کی کوئی قابلِ ذکر کوشش اس دوران میں وہ نہ کر سکے۔ اس ہنگامہ سے فارغ ہونے کے بعد البتہ انہوں نے یکسو ہو کر باہر کی دنیا کی طرف توجہ کی اور سب سے پہلے عراق پر لشکر کشی کا حکم دیا۔ اس لشکر کشی سے ان کا مقصد محض اپنی قوم کو دوسری قوم پر غالب کرنا اور حکمراں بنانا تھا یا دنیا کو عدل و انصاف کے ان اصولوں سے آشنا کرنا تھا جو قرآن کے ذریعہ سے ان کو ملے تھے؟ اس سوال کا بہترین جواب ان کی اس پالیسی سے ملتا ہے جو انہوں نے عراق کے مزارعین اور کسانوں کے بارہ میں، اس جنگ کے دوران میں اختیار کرنے کا اپنے افسروں کو حکم دیا۔ انہوں نے اپنے تمام افسروں کو یہ ہدایت فرمائی کہ کسانوں کے ساتھ نہ تو کوئی بدسلوکی کی جائے نہ ان میں سے کسی کو قتل کیا جائے اور نہ ان کے معاملہ میں کسی اور قسم کی زیادتی کی جائے کیونکہ یہ لوگ ایرانیوں کے ظلم کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاتھوں ان کی تکلیفیں دور ہونی چاہئیں نہ کہ ان کی تکلیفوں میں کوئی اضافہ ہونا چاہیے۔

حضرت ابوبکرؓ کی مذکورہ بالا ہدایات اس امر کو صاف واضح کرتی ہیں کہ ان کی جنگ درحقیقت ظلم و ناانصافی کے اس نظام سے تھی جو ان کے زمانہ میں پایا جاتا تھا۔ وہ اس نظام کو توڑ پھوڑ کر اس کی جگہ اس عادلانہ نظام کو برپا کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو اسلام نے ان کو دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کے تمام مظلوم طبقات نے اسلامی فوجوں کی مزاحمت کرنے کے بجائے ان کا نہایت خوش دلی کے ساتھ خیر مقدم کیا صرف اس طبقہ نے ان کی مزاحمت کی جو اس باطل نظام سے ناجائز فائدے اٹھا رہا تھا اور یہ طبقہ اقلیت میں ہونے کے علاوہ اخلاقی پہلو سے بھی اس قدر بے وزن تھا کہ اسلامی افواج کے سیلِ رواں کے مقابل میں اس کی حیثیت پرکاہ سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ کی پالیسی کے یہ اصول ان کی جس تقریر سے ماخوذ ہیں اب میں اس کو خود ان کے الفاظ میں یہاں پیش کیے دیتا ہوں اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ یہ میں نے جو کچھ لکھا ہے درحقیقت ان کی پہلی تقریر کی شرح ہے۔ ترتیب میں معمولی تصرف کے سوا کوئی ایسی بات میں نے ان کی طرف منسوب نہیں کی ہے جو انہوں نے نہ فرمائی ہو۔ انہوں نے فرمایا:

"اما بعد! اے لوگو، میں آپ کا امیر بنا دیا گیا ہوں، حالانکہ میں آپ سے بہتر نہیں ہوں اگر میں ٹھیک کام کروں تو میری مدد کیجیے اور اگر میں غلط کام کروں تو مجھے سیدھا کر دیجیے۔ راست بازی کے ذرائض

باقی صفحہ ۴۴ پر

سید ظہیر محمد

ہامان کی اثری تحقیق

ہامان نام کی دو شخصیتوں کا ذکر دو مقدس کتابوں میں ملتا ہے۔ ان میں سے قدیم تر ہامان کا ذکر قرآن مجید میں ۳ مقامات پر آیا ہے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ٥ وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ٥ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُم مَّا كَانُوا يَحْذَرُونَ ٥
(القصص — ۲۸ : ۴ - ۶)

بے شک فرعون سرزمین مصر میں بہت سرکش ہو گیا تھا اور اس نے اس کے باشندوں کو مختلف طبقوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک گروہ — یعنی بنی اسرائیل — کو اس نے دبا رکھا تھا ان کے بیٹوں کو ذبح کر چھوڑتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا بے شک وہ زمین میں فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا اور ہم یہ چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جو ملک میں دبا کر رکھے گئے تھے اور ان — یعنی بنی اسرائیل — کو پیشوا بنائیں اور ان کو وراثت بخشیں اور ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں اور فرعون و ہامان اور ان کی فوجوں کو ان کے ہاتھوں وہ دکھائیں جس کا وہ اندیشہ رکھتے تھے۔

۲۔ فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا ۗ إِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا كَانُوا خَاطِئِينَ ٥
(القصص — ۲۸ : ۸)

تو فرعون کے گھر والوں نے اس — یعنی حضرت موسیٰ — کو اٹھا لیا کہ وہ ان کے لیے دشمن اور باعث غم بنے۔ بے شک فرعون و ہامان اور ان کے اہل لشکر بڑے چوک ہوئے۔

۳۔ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي

اور فرعون نے کہا: اے درباریو! میں تو تمہارے لیے اپنے سوا کسی اور معبود سے واقف نہیں تو

فَأَوْقِدْ لِي يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّينِ فَاجْعَلْ لِّي صَرْحًا لَّعَلِّي أَطَّلِعُ إِلٰى إِلٰهِ مُوسٰى وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ مِنَ الْكٰذِبِينَ ٥ (القصص - ۲۸ : ۳۸)

اے ہامان! تم مٹی کی اینٹوں کا پزاوہ لگواؤ اور میرے لیے ایک اونچا محل بنواؤ کہ میں موسیٰ کے خدا کو جھانک کر دیکھوں، میں تو اس کو ایک جھوٹا آدمی خیال کرتا ہوں۔

د - وَقٰرُونَ وَفِرْعَوْنَ وَهٰمٰنَ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانُوا سٰبِقِينَ ٥ (العنکبوت - ۲۹ : ۳۹)

اور قارون و فرعون اور ہامان کو بھی ہم نے ہلاک کر دیا اور موسیٰ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انہوں نے ملک میں گھمنڈ کیا اور وہ ہمارے قابو سے باہر نکل جانے والے نہ بن سکے۔

ہ - وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ۙ إِلٰى فِرْعَوْنَ وَهٰمٰنَ وَقٰرُونَ فَقَالُوا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ٥ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوا أَبْنَآءَ الَّذِينَ اٰمَنُوا مَعَهُ وَاسْتَحْيُوا نِسَآءَهُمْ ۚ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِينَ إِلَّا فِي ضَلٰلٍ ٥ (المومن - ۴۰ : ۲۳ - ۲۵)

اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور ایک واضح سند کے ساتھ، فرعون، ہامان اور قارون کی طرف۔ تو انہوں نے کہا کہ یہ تو ایک جادوگر لپاڑیا ہے۔ پس جب وہ آیا ان کے پاس، ہمارے پاس سے حق لے کر، انہوں نے کہا ان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کرو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھو اور ان کافروں کی چال بالکل رائگاں گئی۔

و - وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِي صَرْحًا لَّعَلِّي أَبْلُغُ الْأَسْبٰبَ ۙ أَسْبٰبَ السَّمٰوٰتِ فَأَطَّلِعَ إِلٰى إِلٰهِ مُوسٰى وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ كَاذِبًا ۚ وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوٓءُ عَمَلِهِ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيلِ ۚ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ إِلَّا فِي تَبَابٍ ٥ (المومن ۴۰ : ۳۶ - ۳۷)

اور فرعون نے کہا: اے ہامان! میرے لیے ایک عمارت بنوا کہ میں اطراف میں پہنچوں، آسمانوں کے اطراف میں، پس موسیٰ کے رب کو جھانک کر دیکھوں، میں تو اس کو بالکل جھوٹا خیال کرتا ہوں۔ اور اس طرح فرعون کی نگاہوں میں اس کی بدعملی کھبا دی گئی اور وہ سیدھی راہ سے روک دیا گیا اور فرعون کی چال برباد ہو کے رہی۔

ان چھ مقامات کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس فرعونِ مصر کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے، ہامان اس کے اعیان و ارکانِ سلطنت میں مقابلۃً زیادہ بااثر، مقتدر، صاحبِ جاہ و حشم

اور معتمد تھا۔ نیز وہ مذہبی امور میں فرعون کا صلاح کار تھا اور اینٹیں پکوا کر ایک فلک بوس عمارت بنوانے پر قادر تھا اور وہ فرعون کی طرح افواج قاہرہ کا سالارِ اعظم بھی تھا۔

دوسرے ہامان کا ذکر عہد نامہ عتیق (OLD TESTAMENT) کی کتاب آستر میں ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہامان ایران کے ایک بادشاہ اخسویرس (AHASUERUS) کا وزیر اعلیٰ تھا یہ ایرانی سلطنت کے تمام یہودیوں کی نسل کشی کے درپے تھا لیکن آستر نامی یہودی حسینہ نے شاہ مذکور کو اپنے دامِ تزویر میں گرفتار کر لیا اور اس کی ملکہ بننے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کی فسوں گری اور سازش کے نتیجہ میں یہ ہامان خود مع اپنے لڑکوں کے اس اونچی پھانسی پر لٹکایا گیا جو اس نے یہودیوں کے لیے تیار کرائی تھی۔
مستشرقین کی ایک جماعت نے جن کا سرگروہ مرشی (MARRACCIO) تھا، اول الذکر ہامان کی تاریخی حیثیت پر ۱۶۹۸ء میں اعتراضات کا سلسلہ شروع کیا، جس پر بعد میں جارج سیل، ڈاکٹر وہیری، ڈاکٹر نوری، پروفیسر لیمنز، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام نے اپنے اعتراضات کی بنیاد رکھی۔

ان اعتراضات کا ماحصل یہ ہے کہ ہامان دراصل، جیسا کہ کتاب آستر میں مذکور ہے، اخسویرس نامی شاہِ ایران کا وزیر ہی تھا، لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نعوذ باللہ شدید تاریخی غلطی کھا کر طولِ بُعدِ زمانہ کے باوجود اسے فرعونِ موسیٰ کا وزیر بنا دیا اور بائبل میں مذکور مینارِ بابل کے ذکر پر مبنی ایک غلط سلط کہانی بنا لی جس کے مطابق جب حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو خدائے واحد دیکتا کا پیغام پہنچایا تو اس نے ہامان کو حکم دیا کہ وہ مٹی کی اینٹیں پکوا کر ایک فلک بوس عمارت تعمیر کروائے تاکہ اس پر چڑھ کر وہ آسمان پر جا کر دیکھے تو سہی کہ وہاں موسیٰؑ کا خدا ہے بھی؟ اگرچہ وہ اپنے دل ہی دل میں موسیٰؑ کو ایک جھوٹا جادوگر ہی خیال کرتا تھا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم نے تفسیرِ ماجدی، جلد پنجم کے صفحہ ۸۰ پر تحریر فرمایا ہے: "جس طرح ہامان کا عطف فرعون کے ساتھ یہاں اور آگے چل کر بھی آیا ہے اس سے تو قیاس یہی ہوتا ہے کہ جس طرح فرعون شخصی نام نہیں بلکہ شاہی لقب تھا، اسی طرح ہامان بھی کوئی سرکاری لقب ہی تھا۔ تاریخ سے اتنا تو بہرحال ثابت ہے کہ مصر کے ایک بہت بڑے دیوتا کا نام آمن (AMON) تھا اس کے بڑے پجاری کے اختیارات بادشاہ سے بس کچھ ہی کم ہوتے تھے۔ کیا عجب کہ اس بڑے پجاری کا سرکاری لقب عربی تلفظ میں ہامان ہی ہو" اسی قیاس کا اظہار مولانا نے اپنی کتاب اعلام القرآن میں فرمایا ہے۔ البتہ انہوں نے اپنی انگریزی تفسیر میں سورۃ القصص کے نوٹ نمبر ۱۰۰ اور نمبر ۲۱۰ میں یہ تاثر دیا ہے کہ آمن دیوتا کے بڑے پجاری کا لقب ہی ہامان تھا، لیکن راؤلنسن کی کتاب 'مصر قدیم' کے صفحہ ۲۸۹، جس کا حوالہ دیا گیا ہے، یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔ مولانا مرحوم کی تحقیق کا نتیجہ سید نواب علی کی تحقیق سے کچھ مختلف نہیں جو

انہوں نے "تاریخ صحف سماوی" میں رقم کی ہے۔

مصرِ قدیم کے آثار کے ماہرین اور مشہور زمانہ مؤرخین کی بے لاگ تحقیقات نے حال ہی میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ اول الذکر ہامان مسلم الثبوت تاریخی حیثیت کا مالک تھا۔ پروفیسر فلنڈرز پیٹری (FLINDERS PETRIE) نے اپنی کتاب (RELIGIOUS LIFE IN ANCIENT EGYPT) کے صفحات ۲۰، ۲۱ پر لکھا ہے کہ آمن دیوتا کی پرستش لیبیا کے نخلستانی علاقہ سے شروع ہو کر مصر اور کار تدریج میں پھیلی جہاں اس کا نام "آمن" "ہیمن" "یا بعل ہامان" میں تبدیل ہو گیا۔ اسی محقق نے اپنی ایک دوسری کتاب (THE RELIGION OF ANCIENT EGYPT) کے صفحہ ۳۰ پر لکھا ہے کہ تھیبس (THEBES) میں واقع اس دیوتا کے مندر کا بڑا پروہت مینڈھے کی کھال کا لبادہ زیب تن کر کے اور سر پر مینڈھے کی کھوپڑی پہن کر ہامان کا روپ اور نام اختیار کر لیتا تھا گویا وہ اس بھیس میں خود آمن یا ہامان کہلاتا تھا۔ والس بج (SIR WALLIS BUDGE) کی کتاب (EGYPTIAN RELIGION) کے صفحات ۱۰۵ تا ۱۰۶ اور پروفیسر ارمن (ADOLF ERMAN) کی کتاب (ANCIENT EGYPTIAN RELIGION) کے صفحات ۱۰۰ تا ۱۰۱ کے مطالعہ سے مزید وضاحت ہو جاتی ہے کہ مصر کے رواج کے مطابق دوسرے دیوتاؤں کے پجاری اور پجارنیں بھی خود ان دیوتاؤں کا روپ اختیار کر کے ان کا کردار ادا کیا کرتے تھے۔ دیکھیں انسائیکلوپیڈیا بریٹینکا کے انسائیکلوپیڈیا جلد دہم کے صفحہ ۵۹۵ کے مطالعے سے بھی اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے کہ مصری دیوی دیوتاؤں کے پجاری اور پجارنیں ان دیوی دیوتاؤں کا بھیس اور نام اختیار کر لیتے تھے اور ان کا کردار ادا کیا کرتے تھے۔ الغرض آمن یا ہامان دیوتا کا بڑا پروہت جو حضرت موسیٰؑ کا ہم عصر تھا وہ ہامان تھا جس کا تذکرہ قرآن مجید نے فرعون کے قصہ میں کیا ہے۔

پروفیسر شٹائن ڈورف (STEINDORFF) نے اپنی کتاب (RELIGION OF ANCIENT EGYPT) کے صفحات ۹۶ تا ۹۷ پر لکھا ہے کہ ہامان جس کا تشخص ہم اوپر کر چکے ہیں، دیوتاؤں کی عمارات اور اہرام کی تعمیر و مرمت کا مہتمم، دیوتا کی افواج کا سپہ سالار، خزانہ کا منصرم اور اناج کے ذخائر کا منتظم تھا۔ علاوہ بریں ملک کے تمام دیوتاؤں کے چھوٹے بڑے پروہت اسی کے زیر نگیں ہوتے تھے۔ اس کی کثیر دولت و ثروت اور اثر و رسوخ کا مزید اندازہ لگانے کے لیے پروفیسر بریسٹڈ (BREASTED) کی کتاب (A HISTORY OF EGYPT) کے صفحات ۲۴۴ اور ۵۲۰ اور پروفیسر پیٹری (FLINDERS PETRIE) کی کتاب (RELIGIOUS LIFE IN ANCIENT EGYPT) کے صفحات ۵۴ تا ۵۵ ملاحظہ کرنے چاہئیں۔

فرعون کو جب حضرت موسیٰؑ نے خدائے واحد و یکتا پر ایمان لانے کی دعوت دی تو فرعون اور اس کے

اعیان و ارکان سلطنت نے جن میں ہامان بھی شامل تھا اور قارون نے جو یہودی الاصل تھا ازراہ استکبار ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ فرعون خود کو دیوتا سمجھتا تھا اور خدائی کا دعویدار تھا۔ علاوہ ازیں وہ کوئی دو ہزار کے لگ بھگ دوسرے دیوتاؤں کو بھی مانتا تھا۔ اس نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت کو اپنی اور دیگر دیوتاؤں کی خدائی کے خلاف بغاوت تصور کیا۔ پروفیسر بریسٹڈ (BREASTED) کی کتاب (DEVELOPMENT OF RELIGION AND THOUGHT IN ANCIENT EGYPT) کے صفحہ ۱۵۲ اور پیٹری (FLINERS PETRIE) کی کتاب (RELIGIOUS LIFE IN ANCIENT EGYPT) کے صفحات ۴۸ اور ۲۰۸، ۲۰۹ پر مذکور ہے کہ "سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ کر دیوتاؤں سے ملنے" کا عقیدہ قدیم مصری مذہب کا ایک اہم جزو تھا۔ اس لیے فرعون نے ہامان کو، جو دیوتاؤں کی عمارتیں تعمیر کروانے پر بھی مامور تھا، یہ حکم دیا کہ وہ اینٹیں پکوا کر ایک فلک بوس عمارت بنوائے تاکہ اس پر چڑھ کر وہ موسیٰ کے خدا کی ٹوہ تو لگائے گو دل ہی دل میں اسے پہلے سے یقین تھا کہ موسیٰ جھوٹا جادوگر ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بے شمار اسرائیلی غلام اینٹیں بنانے پر مامور تھے جس کا ذکر پیٹری (FLINDERS PETRIE) کی کتاب (EGYPT AND ISRAEL) صفحات ۳۱ تا ۳۳ پر کیا گیا ہے۔ فرعون کا متذکرہ حکم اس وقت کے مذہبی عقائد کے مطابق تھا اور اس سے تمسخر یا تعجب کا کوئی پہلو نہیں نکلتا جیسا کہ ہمارے چند مفسرین نے بیان کیا ہے۔

اب یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے معترضین کے اعتراضات کے اصل ماخذ یعنی کتاب آستر اور اس میں مذکور ہامان کی تاریخی حیثیت کا جائزہ لیں، جسے بطور کسوٹی اختیار کر کے انہوں نے اعتراضات کا طومار کھڑا کر دیا ہے۔ ہم قارئین کی توجہ جیوئش انسائیکلوپیڈیا کی جلد ۵ کے صفحات ۲۳۵، ۲۳۶، یونیورسل جیوئش انسائیکلوپیڈیا کی جلد ۴ کے صفحہ ۱۷۰، ایک جلدی تفسیر بائبل صفحہ ۳۹۳ اور انسائیکلوپیڈیا ببلیکا کی جلد ۲ کے کالم ۱۴۰۰ تا ۱۴۰۷ پر مرقوم مؤقر آرا کی طرف مبذول کراتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ہم اس حتمی فیصلہ پر پہنچتے ہیں کہ کتاب آستر کی قطعاً کوئی تاریخی حیثیت نہیں۔ اکثر علمائے یہود و نصاریٰ اسے ایک عشقیہ رومان سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ نیز ہامان سمیت اس کے کردار فرضی ہیں۔ ڈکشنری آف بائبل مؤلفہ جیمز ہیسٹنگز کے صفحہ ۲۴۰ کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب آستر کے مصنف نے بابلی اور ایلمی دیوی دیوتاؤں یعنی ہمان، مردک اور اشتر کے ناموں کو بگاڑ کر اپنے اہم کرداروں کے نام ہامان، مردکی اور آستر رکھ دیے ہیں۔ نیز یہ امر بھی طالب توجہ ہے کہ پہلی دو صدی عیسوی تک علمائے یہود میں یہ مسئلہ باعث نزاع رہا کہ کتاب آستر کو عہد عتیق میں شامل کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ بالآخر اسے شامل کرنے کا فیصلہ محض اس وجہ سے کیا گیا کہ آستر کے

افسانہ پر یہودیوں کے مقبول عام تہوار پورم (PURIM) کی بنیاد رکھی گئی ہے اور عوام کی رائے یہی تھی کہ اسے ان کی نام نہاد الہامی اور آسمانی کتاب کا حصہ بنایا جائے۔ چنانچہ ایسا ہو کر رہا۔ اس پر طرہ یہ کہ چونکہ کتاب آستر کے اصل مصنف نے اس میں نہ تو خدا کا ذکر کیا تھا اور نہ کسی مذہبی عبادت کا، اس لیے ایک بعد کے مصنف نے اس میں چند ابواب بڑھا دیے اور اس طرح یہ کتاب تحریف سے بھی محفوظ نہ رہ سکی۔ مارٹن لوتھر نے تو بصد حسرت و یاس یہ تک کہہ دیا کہ کاش کتاب آستر بائبل میں شامل ہی نہ ہوتی۔

الغرض تحقیق کی رو سے مستشرقین کے علی الرغم کتاب آستر کے ہامان کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں جبکہ قرآن مجید میں ہامان کا جو تذکرہ ہے اس کے ایک ایک لفظ کو جدید اثری تحقیق نے بالکل صحیح پایا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ قرآن پاک میں دی ہوئی ہامان کی تفصیل سے یہود و نصاریٰ کے صحیفے یکسر خالی ہیں۔ اس سے ہر ذی عقل انسان اس نتیجہ تک پہنچے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت یہود و نصاریٰ کے کسی عالم، کاہن، ربی یا مورخ کو ہامان کی شخصیت کا کوئی علم نہ تھا لہٰذا آنحضرت یہود و نصاریٰ کے کسی عالم یا کسی غیر عرب اتالیق سے سن کر یہ تذکرہ قرآن مجید میں درج نہیں کر سکتے تھے، جیسا کہ مستشرقین کا دعویٰ ہے۔ ان تفاصیل سے تو انسائیکلوپیڈیا بریٹینکا کے فاضل مولفین اور تاریخ کے مشہور محقق ہٹی تک بھی بے خبر ہیں۔ فقط ہامان کی تحقیق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن بلاشبہ ایک الہامی کتاب اور ایک ابدی معجزہ ہے اور یہ نبی امی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب وحی رسول ہونے کی ایک قطعی دلیل ہے۔

بقیہ: اسلامی معاشرہ کا سب سے بڑا آدمی (۲)

کو انجام دینا امانت کو ادا کرنا ہے اور جھوٹ اور فریب سے کام لینا خیانت ہے۔ آپ کے اندر جو بے اثر ہے وہ میرے نزدیک بااثر ہے یہاں تک کہ ان کا حق ان تک نہ لوٹا دوں (ان شاء اللہ) جو آپ کے نزدیک بااثر ہے وہ میرے نزدیک بے اثر ہے یہاں تک کہ میں اس سے حق وصول کر لوں (ان شاء اللہ) کوئی قوم اللہ کی راہ میں جہاد کو نہیں چھوڑتی ہے مگر اللہ اس کو ذلیل کر دیتا ہے اور کسی قوم میں بدکاری عام نہیں ہوتی ہے مگر اس پر اللہ کی طرف سے عام تباہی آجاتی ہے۔ میری اطاعت کیجیے جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں، اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو پھر آپ کے اوپر میری اطاعت کی ذمہ داری نہیں ہے۔"

تالیفاتِ امام حمید الدین فراہیؒ

	روپے پیسے
۱۔ مجموعہ تفاسیرِ فراہی :	۶۰-۰۰
۲۔ اقسام القرآن :	۵-۰۰
۳۔ ذبیح کون ہے ؟	۵-۰۰

تالیفاتِ مولانا امین احسن اصلاحی

۱۔ تدبرِ قرآن ؛ (مکمل سیٹ : ۹ جلد) :	۸۱۰-۰۰
فی جلد :	۹۰-۰۰
۲۔ مبادئ تدبرِ قرآن :	۱۶-۰۰
۳۔ اسلامی قانون کی تدوین :	۱۲-۰۰
۴۔ اسلامی ریاست :	۳۰-۰۰
۵۔ اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل :	۱۶-۰۰
۶۔ قرآن میں پردے کے احکام :	۳-۰۰
۷۔ تنقیدات :	۱۸-۰۰
۸۔ توضیحات :	۲۱-۰۰
۹۔ تزکیۂ نفس : جلد اول	۴۵-۰۰
جلد دوم :	(زیرِ طبع)
۱۰۔ اصولِ تدبرِ حدیث :	(//)
۱۱۔ دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار :	(//)
۱۲۔ اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام :	(//)
۱۳۔ حقیقتِ شرک و توحید :	(//)
۱۴۔ حقیقتِ نماز :	(//)
۱۵۔ حقیقتِ تقویٰ :	(//)

فاران فاؤنڈیشن

۱۲۲۔ فیروزپور روڈ، اچھرہ، لاہور-۱۶ (پاکستان) فون : ۴۱۰۸۴۹